بنظریۂ حکیم ناصر خسرو علوی قدّس اللہ سرّہ

سلسلۂ نورِ امامت

۱۹۵۷ء

علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

بتوفیقِ خُداوندِ خزائنِ علم و حکمت و بفیضِ مالکِ جُود و رحمت

این کتاب فتحِ بابِ

گنجِ سعادت

یعنی

سلسلۂ نورِ امامت

بنظریۂ حکیم ناصر خسرو علوی قدّس اللہ سرّہ

از

علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

شائع کردہ

المعہد للحکمۃ الرّوحانیۃ والعلم المنیر

www.monoreality.org
www.ismaililiterature.com
www.ismaililiterature.org
global-lectures.com
©2024

تاریخِ طباعت

۱۹۵۷ء

۱۹۹۳ء

۲۰۲۴ء

ISBN 1-903440-92-0

فہرستِ مضامین

۱۔ حرفِ آغاز ۱

۲۔ بحُسنِ دگر (نظم) ۶

۳۔ نُورِ مولانا کریم (نظم) ۸

۴۔ حقیقتِ شُکر ۱۱

۵۔ رسولِ خداؐ کی وصیّت ۱۸

۶۔ اصلُ الاصُول ۲۱

۷۔ اُصولِ دین ۲۲

۸۔ فُروعِ دین ۲۳

۹۔ اُصولِ دین کی تشریح ۲۴

(i) اصلِ اوّل عقلِ کُل ۲۴

(ii) اصلِ دُوم نفسِ کُل ۲۵

(iii) اصلِ سوم ناطق ۲۵

(iv) اصلِ چہارم اساس ۲۶

۱۰۔ فُروعِ دین کی تشریح ۳۰

(i) فرعِ اوّل جدّ ۳۰

(ii) فرعِ دُوُم فتح ۳۱

(iii) فرعِ سوم خیال ۳۱

(iv) فرعِ چہارم امام ۳۴

(v) فرعِ پنجم حجّت ۴۰

(vi) فرعِ ششم داعی ۴۲

۱۱۔ اشکال تمثیلی ۳۵

۱۲۔ دربیانِ ایّامِ عالمِ دین ۴۵

۱۳۔ امامِ زمان کی پہچان اور اس کی اطاعت کے بیان میں ۴۹

۱۴۔ تفسیر وجہ اللہ ۵۸

۱۵۔ امامِ زمان نورِ خداوندی ہے ۶۲

۱۶۔ دربیانِ علم ۷۶

۱۷۔ حُدود ایک وقتِ معیّن تک ہیں ۷۸

۱۸۔ امامِ مبینؑ ۸۲

۱۹۔ حقیقتِ کُل و جُزو ۹۷

۲۰۔ چاروں اصل امامِ زمانؑ میں ۱۰۳

۲۱۔ تطابق دَورِ مہین و دَورِ کہین و ایّامِ ہفتہ ۱۰۷

۲۲۔ وحدت ہر ہفتی از اشخاصِ امامت چون ہفتۂ دین و دنیا ۱۰۸

۲۳۔ خراجِ عقیدت از اسماعیلیۂ چین - دوستِ مصطفیٰ (نظم) ۱۰۹

۲۴۔ جذبۂ روحیۂ اسماعیلیٔ شرقی ترکستان - غلامِ علیٔ (نظم) ۱۱۲

۲۵۔ مُکرمانہ ہدیۂ ناچیز را چیزے شمار (نظم) ۱۱۵

۲۶۔ فہارس ۱۱۷

حرفِ آغاز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

المائدہ کے اس ارشادِ مبارک میں دینِ اسلام کی اساسی ہدایت کا ذکر فرمایا گیا ہے: قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ = تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے (۵:۱۵)۔

سوال: اس میں کیا راز ہے کہ آیۂ کریمہ کی ترتیب میں نور کا ذکر پہلے آیا ہے، اور کتاب یعنی قرآن کا ذکر بعد میں ہوا ہے؟

جواب: اس کا راز یہ ہے کہ پہلے پہل حضرت محمد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نورِ نبوّت کی روشنیوں سے منوّر ہوگئے، اور اس کے بعد نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔

سوال: نور اور کتاب کے اس یکجا بیان میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: اس کا اشارۂ حکمت ایک تو یہ ہے کہ نور اور کتاب باطن میں ایک چیز ہے، اور ظاہر میں دو چیزیں ہیں، یعنی شخصیّتِ نور، اور کتابِ سماوی، دوسرا اشارہ یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ ہمیشہ معلّمِ ربّانی مقرر ہوتا ہے، اور یہی زندہ نور ہے، جس کی روشنی میں آسمانی کتاب کا نام کتابِ مبین (بیان کرنے والی کتاب) ہے۔

سوال: مذکورۂ بالا ارشاد سے ماقبل اور مابعد کی ایک ایک حکمت بیان کریں، تاکہ یہ حقیقت کلّی طور پر یقینی ہو جائے کہ خدا نے ہر آسمانی کتاب کیلئے ایک نورانی

معلّم (نور) مقرر فرمایا ہے۔

جواب : آیۂ کریمہ (۵:۱۵) کے شروع میں ایک مفہوم یہ ہے کہ تورات اور انجیل جب اہلِ کتاب کے عام مُعلّموں کے ہاتھ آئیں تو انہوں نے آسمانی کتاب کے حقائق و معارف کو خیانت سے بھی اور ناشناسی سے بھی چُھپا لیا، کیونکہ ان میں نور نہیں تھا، اور مابعد (۵:۱۶) کی ایک حکمت یہ ہے : خدا نور اور کتابِ مبین کے ذریعے سے ان لوگوں کو جو بہشت سے بھی بڑھ کر اس کی خوشنودی کے طالب ہیں سلامتی کی راہوں (شریعت، طریقت، حقیقت، اور معرفت) پر چلاتا ہے، اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور صراطِ مستقیم کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے (۵:۱۶)۔

"سلسلۂ نورِ امامت" میری اوّلین تصنیف ہے، ادبی اعتبار سے جیسی بھی ہو، لیکن اس کو بہت بڑی سعادت نصیب ہوئی کہ حضرتِ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ و سلامہ کے حضورِ اقدس میں پیش کی گئی، اور نظرِ نورانی سے مشرّف ہوئی، یہ وہ مبارک سال تھا جس میں مولانا حاضر امامؑ تختِ امامت پر جلوہ گر ہوئے تھے (یعنی ۱۹۵۷ء)۔

میں مظہرِ نورِ خدا، آلِ مصطفیٰؐ، جانشینِ علیؑ مُرتضیٰؑ کے مقدّس در پر بڑی غریبی، حاجت مندی اور عاجزی سے حاضر ہوا تھا، اسلئے جھولی بھر دی گئی، حق بات کو کسی بھی وجہ سے چُھپانے سے دوستوں اور بھائیوں کا علمی نقصان ہو سکتا ہے، اس لئے میں انتہائی عاجزی سے عرض کرتا ہوں کہ میں نورِ امامت کے اصولی معجزات کا عرصۂ دراز سے مشاہدہ کرتا رہا، یہی وجہ ہے کہ میں ہر بار نور کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کیلئے سعی کرتا ہوں۔

بعض بھائیوں کا یہ خیال ہے کہ روحانیت اور نورِ امامت کے اسرار کا برملا تذکرہ نہیں کرنا چاہئے، قربان جاؤں انکی خیر خواہی سے، بیشک ہر مُبتدی کو ایسا نہیں

کرنا چاہیئے، جب تک کہ اس میں علم کی پختگی نہیں آتی، اور قرآنی حکمت سے آگاہ نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر کوئی شخص نور اور قرآن کے روحانی اور عقلانی عجائب و غرائب اور علم و حکمت کے معجزات کا مشاہدہ کر کے خاموش رہتا ہے تو کیا ایسا شخص قارون کی طرح نہیں ہوگا، جو مالی زکات نہ دینے کی وجہ سے ہلاک ہوگیا؟ کیونکہ مالی زکات مثال ہے، اور علمی زکات ممثول (۲۸:۷۶) اور علم و حکمت کی یہ روشنی ایک گواہی بھی ہے جس کو اگر کوئی شخص چھپائے تو وہ بہت بڑا ظالم قرار پاتا ہے (۲:۱۴۰)۔

نور سلسلۂ انبیاء کے بعد سلسلۂ ائمہ میں چلا آیا ہے، اس امرِ واقعی کے مطابق اس کتاب کا نام "سلسلۂ نورِ امامت" مقرر ہوا، کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر عظیم دوستوں نے انگلش میں اس کا ترجمہ بھی فرمایا ہے۔

اس میں علمِ حدودِ دین کا ایک حصّہ بھی ہے، کیونکہ تاویلی حکمت کے ابواب انہی حدود کی کلیدوں سے مفتوح ہو جاتے ہیں، اور اسکی اہمیت سے یہ بحث الگ ہے کہ اب حدودِ دین کی کیا کیفیّت ہے؟ کیا حضرتِ امامؑ پیدائش کے دن ہی امام ہوتے ہیں یا حدودِ دین کی سیڑھی سے چڑھ کر اپنی مرتبت پر فائز ہو جاتے ہیں؟ بہر حال حدودِ دین کی تاریخی اہمیّت بھی ہے اور ان کے اسماء اصطلاحات بھی ہیں۔

[تورات اور] حدیثِ شریف میں آیا ہے: "اِنَّ لِلّٰہِ مِائَۃَ اَلْفِ نَبِیٍّ وَاَرْبَعَۃً وَ عِشْرِیْنَ اَلْفَ نَبِیٍّ مِنْ وُلْدِ آدَمَ اِلَی الْقَائِمِ" = اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانۂ آدمؑ سے قائم تک (پورے دَور کیلئے) اللہ کی طرف سے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے ہیں (سرائر و اسرار النّطقاء ص ۲۰۰) ان تمام حضرات کے طویل سلسلے کا تذکرہ قرآنِ حکیم کے صرف تین الفاظ میں آیا ہے، وہ پُرحکمت الفاظ یہ ہیں: نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ = ایک نُور پر دوسرا نُور ہے (۲۴:۳۵) یعنی نُور کی ایک شخصیت کے بعد دوسری شخصیت ہوتی ہے، پس نورِ نبوّت کے بعد نورِ امامت کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور کوئی

وقت ایسا نہیں، جس میں نُور نہ ہو۔

یہ تاویلی مثال ہے : نُور کو سرچشمہ اور مرکز میں دیکھنا ہے تو سورج کو دیکھ لو، نمائندۂ واحد میں دیکھنا ہو تو چاند کو دیکھ لو، کثیرِ مظاہر میں دیکھنا ہے تو ستاروں کو دیکھو، اور اگر نُور کو گھر لاکر قریب ہی سے دیکھنا اور پہچاننا ہے تو گھر کا چراغ روشن کرو، چراغِ خانہ سے نُورِ معرفت مراد ہے جو قلب میں ہوتا ہے، یہ چراغ بھی ہے اور آفتاب بھی، یہی سبب ہے کہ نُورِ الٰہی کی تشبیہ و تمثیل گھر کے چراغ سے دی گئی ہے (۲۴:۳۵)۔

تاویل کی زبان میں ظاہر کو دن اور باطن کو رات کہا گیا ہے، یعنی تنزیل دن ہے اور تاویل رات، چنانچہ نُورِ نبوّت آفتاب ہے، یعنی وہ روشنی جو ظاہر و تنزیل کیلئے چاہیئے، اور نُورِ امامت ماہتاب ہے یعنی ایسی روشنی جو باطن و تاویل کے واسطے ضروری ہے، اب یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ تمام ستارے اپنی اپنی جگہ سورج ہی کے نمائندے ہیں لیکن صرف چاند ہی وہ واحد نمائندہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے اہلِ زمین کو بھرپور روشنی دے سکتا ہے، اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ ائمّۂ سلف علیہم السّلام مسافتِ زمان کی وجہ سے ستاروں کی طرح رسائی سے بالاتر ہیں، لیکن امامِ وقت صلوات اللہ علیہ وسلامہ چاند کی طرح نزدیک ہے جو روحانی علم اور تاویلی حکمت کا وسیلۂ واحد ہے۔

جس طرح ظاہری سائنس اور ریسرچ ہے اسی طرح روحانی سائنس اور اس کی ریسرچ ہے، مثال کے طور پر یہاں خدا کے فضل و کرم سے یہ تحقیق کی گئی ہے کہ کائنات کے اکثر ستاروں پر انتہائی ترقّی یافتہ انسان رہتے ہیں، وہ کوکبی بدن (Astral Body) رکھتے ہیں، اس جسمِ لطیف کے کئی نام ہیں، جیسے جسمِ مثالی، نورانی پیکر، جُثّۂ ابداعیہ وغیرہ، اللہ کی قسم! قرآن اور رُوحانیت میں علم و معرفت کی ہر چیز موجود

ہے۔

چونکہ "جشنِ خدمتِ علمی" کی آمد آمد ہے، اس لئے میں اپنے تمام ساتھیوں کو جو بے حد عزیز ہیں صمیمیّتِ قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور انتہائی عاجزی سے دعا ہے کہ پروردگارِ عالم آپ عزیزان کی علمی کوششوں کو کامیابی عطا فرمائے! اور وہ دانا و بینا اپنی رحمتِ بیکران سے آپکی اِس بے لَوث خدمت کو سب کیلئے مفید بنائے! آمین!!

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی

پیر ۲/ ربیع الثّانی ۱۴۱۴ھ - ۲۰/ ستمبر ۱۹۹۳ء کراچی

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بحُسنِ دگر

یارِ من! جامهٔ نو پوش و بحُسنِ دگر آ
با جهان ساز و برانداز زمان پُر هنر آ

قصرِ شاهانهٔ تن ساختهٔ چون قصرِ بهشت
بتو زیباست شهازود درین قصر در آ

همچو خورشید پسِ کُرّهٔ گِل دیر مکن
برق وار از افقِ مشرقِ دین زود برآ

بتو زیبا نبُوَد آنکه نشینی بر خاک
نورِ چشمِ دلِ ما! آ بنشین در نظر آ

یار و اغیار همه منتظرِ دَورِ تو اند
ای تو استادِ قدیم با صفتِ تازه تر آ

دیده ام دیدهٔ دل مردمکِ دیده تُو ای
با همان جلوه دگر بار مرا در نظر آ

جُز بدیدارِ تو این تلخیِ جان می نرود
ای تو شیرینیِ جان! با همه قند و شکر آ

گرچه من راه نشینم تو شهنشاهِ دو کون
شفقت و مهر نما و زپیِ ما چون پدر آ

تا همه ماه رُخان عاشقِ رُویِ تو شوند
نورِ رویت بنما مایهٔ شمس و قمر آ

با جلالت بنشین بر سرِ مسند که شه ای
با همه عظمتِ شاهانه و با کرّ و فر آ

تو که داری ز ازل تجربهٔ جنگِ فلک
شاهِ مردان! تو بی جوشن و تیغ و سپر آ

با همین بال و پرت کی برسی از پیِ او
باز گردای که تو خواهی! بدگر بال و پر آ

جستجوی کن و مفتاحِ سعادت دریاب
پس بگنجینهٔ اسرار شو و پُر گهر آ

پیشِ آن شاه که خوانندهٔ لوحِ دلِ توست
از خود آگاه شو و با ادب و باخبر آ

گر تو از جورِ فلک عرضِ شکایت داری
از رهِ صدق و صفا پیشِ شه داد گر آ

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science knowledge for a united humanity

زان درختی که بُوَد پاک و پُر از میوه مدام
خوش بخور میوهٔ دانش، همه زیرِ شجر آ

شادی و خرّمی ای دل! شهِ دیدار رسید
ای غمِ هجر! ازین بیش مرنجان بسر آ

بی پناهِ تو همه مُلک دلم رفته ز دست
باز با لشکرِ جان با همه فتح و ظفر آ

تو لطیفی و هنرهای فراوان داری
گر بظاهر نرسی نور شو و در نظر آ

دلم از بی اثری آهنِ پُر زنگ شده
با همان معجزِ داوَد تو با صد اثر آ

در رهِ عشق چو دریوزه گری بنشینم
ای مهِ چارده! هر بار ازین ره گزر آ

تا نصیر بهرِ نثارِ قدمت جان بدهد
ای شه و جانِ جهان! باز بحُسنِ دگر آ

ISW
Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نُورِ مولانا کریم

مشرقِ انوارِ یزدان نورِ مولانا کریم
مطلعِ اسرارِ عرفان نورِ مولانا کریم

کِسوتِ دیگر همی پوشید آن یارِ قدیم
جلوه ها بنمود در جان نورِ مولانا کریم

تو همان سلطانِ دینی امتحان از ما مگیر
حاضرِ هر عصر و دوران نورِ مولانا کریم

مخزنِ علمِ حقائق معدنِ نورِ وصفا
عالمِ اسرارِ قرآن نورِ مولانا کریم

چشمِ دل بکشا و برقِ رُویِ زیبایش ببین
تا شناسی جان و جانان نورِ مولانا کریم

ظاهراً آلِ محمدؐ هم ز اولادِ علیؑ
اکمل و اشرف ز انسان نورِ مولانا کریم

رهبرِ اسلام امامِ ماشرِ دینِ نورِ حق
شاهِ مردان ماهِ خوبان نورِ مولانا کریم

حاتمِ روحی سخیٔ جان و دل نورِ عقول
مصدرِ اکرام و احسان نورِ مولانا کریم

جوهرِ روحِ مقدس گوهرِ امرِ اله
نائب و فرزندِ سلمان نورِ مولانا کریم

عروة الوثقیٰ کتاب الله و حبل الله حق
مظهرِ آیاتِ رحمان نورِ مولانا کریم

پادشاهِ عالمِ دین والیِ دنیایِ دل
تاجدارِ ملکِ ایمان نورِ مولانا کریم

اخترِ برجِ تجمّل ماهِ گردونِ خیال
آفتابِ کونِ رخشان نورِ مولانا کریم

ای نسیمِ جان فزایِ باغِ فردوسِ برین
نورِ رویِ حور و غلمان نورِ مولانا کریم

بحرِ گوهر زایِ جانها آسمانِ فیض بار
چشمه سارِ آبِ حیوان نورِ مولانا کریم

عقلِ کُلّ و روحِ کُلّ هم مصطفیٰ هم مرتضیٰ
مجمعِ پیدا و پنهان نورِ مولانا کریم

یوسفِ حُسنِ زمان ای شاهِ خوبانِ جهان
ای بهارِ باغِ رضوان نورِ مولانا کریم

منبعِ دریایِ رحمت مخرجِ علم و ادب فیض بخشِ ابرِ نیسان نور مولانا کریم
حامیِ دینِ محمدؐ در لباسِ مرتضیٰؑ کافران را تیغِ برّان نور مولانا کریم
پنجتن را یکتنی ای مقصد و مطلوبِ کُل مذہب و دینِ مریدان نور مولانا کریم

با اُمید آمد بدرگاہت نصیرِ ناتوان
تا کنی ہر مشکل آسان، نور مولانا کریم

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔(۵۷:۱-۳)

ترجمہ: اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہی ہے عزّت وحکمت والا۔ اس کی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ سب چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے سب سے اوّل اور سب سے آخر اور سب سے آشکار اور سب سے پنہان۔ اور وہ سب چیز جانتا ہے۔ (۵۷:۱-۳)

حقیقتِ شُکر

منعمِ حقیقی کی مخصوص انسانی نعمتوں کا معنوی شکر، بشری وسعت کی کسی حد تک اس وقت ادا ہوسکتا ہے جبکہ شاکر کا طریقۂ شکر گزاری ولیِ نعمت کی مرضی کے مطابق ہو۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ شکر قبولِ منعم نہ ہوسکے۔ اصلیّت میں شکر نعمت کے بعد واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ شاہد ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ (۳۱:۱۲) ترجمہ: "اور ہم نے لقمان کو حکمت دی کہ اللہ کا شکر کر"۔ اس لئے شکر کے معنی ہیں نعمت کے حقائق سے منعم کی غرض معلوم کرنا اور اس کی مرضی کے مطابق نعمت کو استعمال کرنا۔ معنوی شکر گزاری کی تفصیل یہ ہے:

ہر نعمت کی وضعیّت، باطنیّت اور غرض و غایت پر غور و فکر سے تبصرہ کرنے کے نتیجوں میں علمِ حقائق الاشیاء (ہر چیز کی حقیقت کا علم) کا حاصل کرنا، ہر نعمت کو منعمِ حقیقی کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا، نعمت کی خوبیوں کے قیاس و دلائل سے منعمِ حقیقی کے اوصاف و کمالات کا جاننا اور اسکی معرفت تلاش کرنا، اس کی دی ہوئی نعمت کو احسانِ محض تصور کرنا اور اس کے عوض میں اپنے حق میں اور خلقِ خدا کے حق میں نیکی کرنا اور سب سے آخری درجوں پر اس بات کا یقین رکھنا کہ صانعِ حکیم نے اپنی حکمتِ بالغہ سے کُل جسمانی و روحانی لذّتوں کو رشتۂ کائنات میں بترتیب فضیلتِ لذّت اسلئے پرویا ہے تاکہ ہر دانا انسان خدائے ذُوالکرام سے وہ نعمت اور وہ لذّت

شب و روز طلب کرے جس میں اپنی لاثانی وغیر فانی اور لاانتہا لذّتوں کے علاوہ بحیثیتِ کُل دیگر ساری لذتیں بھی موجود ہیں۔ وہ لذّتِ کُل دیدارِ الٰہی ہے نعمت شناسی اور قدر دانی بحقیقت اسی مقام پر ہوسکتی ہے۔ نعمت ہر اس چیز کا نام ہے جو جسمانی یا روحانی طور پر انسان کیلئے خوشی، راحت اور لذّت کا موجب بن سکے۔ مگر ہر ایک نعمت میں یہ بات ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ قدر و قیمت اور لذّت میں پچھلی والی نعمت سے بہتر اور اگلی والی نعمت سے کمتر ہوتی ہے۔ مثلاً موالیدِ ثلاثہ یعنی نباتات، حیوانات اور انسان کی غذاؤں پر قیاس لگایئے کہ نباتات کی غذا مٹی، پانی، ہَوا اور آتشی اثرات ہے جو کہ قدر و قیمت اور لذّت میں حیوانوں کی غذا سے بہت کم ہے۔ حیوانات کی غذا ان کی نوعیت کے مطابق ہے۔ مثلاً گھاس، پات، پھل، دانے، گوشت وغیرہ۔

پھر حیوانوں کی یہ غذا نباتات کی غذا سے قدر و قیمت اور لذّت کے لحاظ سے بدرجہا بہتر ہے اور انسان کی غذا سے بدرجہا کمتر ہے۔ لیکن جانور روحِ حیوانی کی فوقیت سے نباتات اور اسکی غذا پر بھی تصرّف کرتا ہے، اسلئے حیوانات کو نباتات کا بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ بعض جانور عناصر سے بھی غذا حاصل کرتے ہیں اور اکثر حیوانات نباتات پر پلتے ہیں۔

اسی طرح انسان کی خوراک قدر و قیمت، ذائقہ اور منفعت میں حیوان کی غذا سے بدرجہا بہتر ہے اور فرشتوں کی غذائے جلالی سے بدرجہا بدتر اور خسیس تر ہے۔ اور انسان بلاشبہ حیوانات، نباتات و جمادات اور دنیا کی ساری چیزوں پر بادشاہ ہے۔ حیوانات، نباتات وغیرہ سے جو چیز منفعت بخش ہو اسے اپنی غذا بنا لیتا ہے۔ لیکن روحانیت کے طلب گاروں کیلئے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موجودہ انسانی جملہ اقسام کی غذائیں باوجود تمام خوبیوں کے حقیقتاً حیوانوں کی غذائیں کہلاتی ہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ غذا کا سوال روح کی حد میں پیدا ہوتا ہے۔ اور روح تین قسم کی ہوتی ہے۔

یعنی روحِ نامیہ جس میں نشوونمائی کی طاقتیں ہوتی ہیں اور وہ ہر قسم کے نباتات و اشجار میں ہوتی ہے۔ اس کی خوراک کا ذکر نباتات کے بیان میں ہو چکا۔ دوسری قسم کی رُوح، روحِ حیوانیہ ہے یہ جملہ اقسام کے جانوروں میں ہوتی ہے۔ اسکی خوراک کا ذکر حیوانوں کے ذکر میں ہو چکا ہے۔ تیسری قسم کی روح نفسِ ناطقہ یا کہ روحِ انسانی کہلاتی ہے۔ لیکن انبیاء و اولیاء کی پاک روح یعنی روح القدس روحِ انسانی سے بالاتر اور اس میں سے مزید ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب زاد المسافرین)

روح کی ظاہری ترکیب میں روحِ نامیہ سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے ہر نبات میں صرف ایک ہی روح ہے۔ اور ہر جانور میں اپنی روح کے علاوہ روحِ نامیہ بھی ہے اور ہر انسان میں اپنی روح کے علاوہ اپنے دونوں ماتحت (حیوان و نبات) کی ارواح بھی ہیں۔ یعنی انسان میں تین، حیوان میں دو اور نبات میں ایک رُوح ہے۔

اب روحِ ناطقہ کی غذا کے متعلق یہ ہے کہ اسکی غذائے مخصوص جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتا، نطق، تمیز، علم و حکمت اور معرفت وغیرہ ہے۔ یعنی موالیدِ ثلاثہ میں سے ہر ایک کی غذائی حدِ فاصل اوپر کی طرف سے ہے، چنانچہ نباتات کی غذا کی حد اتنی تک ہے جتنی کہ وہ طبعی طور پر غذا حاصل کر سکتی ہے۔ اور حیوانوں میں سے ہر ایک حیوان کی اپنی اصلی غذا وہ ہے جو وہ فطری طور پر کھا سکتا ہو۔ اسلئے حیوانوں کی اوپر والی غذائی حدِ فاصل وہاں تک ہے جہاں تک وہ چاہت سے کھا سکتے ہیں۔ پھر درست ہوا کہ انسان ہمیشہ ایک حیوانِ مرکب پر سوار ہے۔ جس پر سے موت سے پہلے اترنا سخت مشکل ہے۔ لہٰذا وہ جسقدر بھی پُر لذّت غذائیں تناول فرماتا ہو وہ سب اپنے اس مرکبِ حیوانی کا حصّہ ہیں جس کا نام نفسِ حیوانی ہے لیکن انسان کی اپنی اصلی غذا وہ ہے جس سے روحِ ناطقہ اور عقل کو قوّت ملے۔ حکیم ناصر خسرو قدس اللہ روحہٗ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

ع چیزی کہ ستوران و ددان با تو شریک اند
منّت ننہد با تو بدان ایزد داور

یعنی جس چیز میں چرنے والے جانور اور درندے بھی تیرے ساتھ شریک ہوں تو اس کے بارے میں خدائے عادل تجھ پر ہرگز احسان نہیں رکھتا ہے۔

ع نعمت نبود آنچہ ستوران بخورندش
نے ملک بود آنچہ بدست آردش قیصر

یعنی نعمت وہ نہیں جسے جانور بھی کھا سکتے ہوں اور نہ وہ بادشاہی ہے جسے قیصر بھی حاصل کر سکتا ہو۔

انسانی نعمت اور شکر کی حقیقت کی مزید معلومات کرنے کی غرض سے قرآنِ حکیم کی اس آیت کی دقیقہ سنجی فرمائیے۔ قولہٗ تعالیٰ: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴:۱۴۷) ترجمہ: "کیا کرے گا اللہ تمہیں عذاب کر کر۔ اگر تم شکر کرو اور مانو اور اللہ قدر دان ہے۔ جاننے والا۔" لیکن لوح التاویل میں اس آیت کے معنی اسی طرح ہے۔ نہیں کرتا (فعل) اللہ تمہارے عذاب (ریاضت) پر (ذریعے سے) اگر تم نعمت جانو اور یقین حاصل کرو۔ اللہ شکر کرانے اور علم سکھانے والا ہے۔ یعنی اگر ہم حقیقی معنوں میں شکر کریں اور کما کان حقہٗ ایمان لائیں تو اللہ ہماری تکلیف کے ذریعہ سے اپنا فعل نہیں کرے گا۔ بلکہ ہماری راحت ہی میں اس کا فعل ہم پر واقع ہوگا۔ جو کہ دونوں صورتوں میں خدا کا فعل صرف ہماری روحانی عروج کیلئے ہے۔ از روئے تاویل کئی دلیلوں سے یہی معنی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس عذاب کو آخرت کا ابدی عذاب تصور کریں تو اللہ ہمیں عذاب سے آگاہ کرنے کے بعد اپنی قدر دانی اور علم پروری کی صفات کی طرف ہمیں متوجہ نہ فرماتا۔ اس لئے کہ قرآنِ حکیم کی حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر آیت کے آخر میں جیسے الفاظ یا اسماء ہوں ان کے

مطابق آیت کا معنی نکلتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، یہ تو احکم الحاکمین کا کلام حکمت نظام ہے۔ جزوی مثال میں بھی کوئی معمولی شعور والا انسان دوسرے انسان کو تکلیف دینے کے بعد اپنی صفت یا فعل مناسب حال الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً یا تو کہتا ہے کہ "اس میں میرا کوئی قصور نہیں اسکی اپنی غلطی ہے"۔ یا یوں کہتا ہے "چکھ لیا! سزا"۔

اس بارے میں یہی ایک دلیل کافی ہے۔ لیکن اس بیان میں جو حقیقتِ شکر کے متعلق ہے یہ بات باقی رہی ہے کہ جس طرح میں نے ہر موقعہ پر علم و حقیقت کی اہمیت ظاہر کی، اسی طرح اس بیان کے آخر میں بھی بتوفیقِ خداوند علوم و حقائق اس بات کو دلیلوں سے محکم کرتا ہوں کہ اللہ نے انسانوں کو دنیا میں علم کی غرض سے پیدا کیا ہے اور یہی انسان کی غرض و غایت ہے۔ پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے علم کو ہر قسم کی نعمتوں کی شکل میں جسمانی و روحانی طور پر موجود کیا ہے۔

ان تمام اقوال و اعمال میں بھی علم رکھا گیا ہے جس کے لئے انسان مامور ہوا ہو۔ غرضیکہ کوئی ایسی شئے نہیں جس میں علم نہ ہو۔ خدائے عزّوجلّ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے فرماتا ہے: وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْماً اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ (۸۰:۶)۔ یعنی "سمو رکھی ہے میرے ربّ نے ہر چیز کو علم میں۔ کیا تم دھیان نہیں کرتے؟" اس سلسلے میں ایک اور حقیقت آپ کی نگاہ کے سامنے رکھتا ہوں جس سے یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ خدائے علیم و حکیم نے ہر مذکور پیغمبر کی ایک مخصوص خوبی قرآن میں ظاہر کی ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کو خلیفہ و مسجودِ ملائک اور صفی کے خطاب سے نوازا۔ حضرت نوحؑ کو شکور کے نام سے یاد کیا۔ ابراہیمؑ کی توحید پرستی کی تعریف کی۔ حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کہلایا۔ حضرت عیسیٰؑ کو اپنی رُوح قرار دی۔ حضرت یوسفؑ کو صدیق بتایا۔ حضرت ایوبؑ میں صبر کی حد بتائی۔ حضرت داؤدؑ کو خلافت عطا کی اور حضرت سلیمانؑ کی مملکت کا ذکر کیا۔ اسی طرح ہر پیغمبر میں ایک

مخصوص چیز ہونے کا ذکر کیا اور سب سے اخیر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سردارِ انبیاء کو معراج کی رات میں اپنی خلوت گاہِ خاص میں لے جانے کی بشارت امّتِ محمّدیہ کو سنا دی۔ اٰمنّا و صدّقنا۔ یہ سب حقیقت ہے۔ اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن آپ یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ جو چیز جس پیغمبر کو دی گئی تھی وہ وہیں پر ختم ہوئی تھی۔ اور دوسرے پیغمبر اس چیز سے محروم رکھے گئے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ہے۔ بلکہ حکیمِ مطلق نے پیغمبروں کی ان خاصیتوں کے پسِ پردہ ایک زبردست حکمت پوشیدہ رکھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام پیغمبر اپنی اپنی خصوصیات کی بناء پر ایک خدائی مقدس کتاب کے عنوانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاکہ حقیقت تلاش کرنے والوں کو سہولت ہوسکے۔

اس قانونِ الٰہی کی بناء پر ہم شکر کی مزید حقیقت حضرت نوحؑ کی تواریخ سے معلوم کر لیتے ہیں۔ کلامِ خدائے جلیل وجبّار: ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷:۳)۔ "اے وہ نسل! جو تم کو نوح کے ساتھ ہم نے اٹھایا، وہ بہت شکر کرنے والا ایک بندہ تھا۔" یعنی اسکے پاس بہت سی روحانی نعمتیں ہیں اور وہ ان کی پوری حقیقت جانتا ہے۔ (كَانَ: تھا، ہے) بغیر تنوین کے (نوح) وہی نوح جو پہلے ہو گزرا ہے اور تنوین کے ساتھ (نوح) کوئی بھی شخص جو جملہ وجوہات سے گذشتہ نوح کی مانند ہو۔ اور کشتی کی حقیقت سنئے: قولِ خدا جلّ جلالہٗ: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱:۳۷)۔ "یعنی بنا کشتی کو ہمارے مشاہدات اور ہماری وحی کے ذریعے سے۔" یعنی عالمِ آفاق و عالمِ نفس کی معلومات سے سفینۂ نجات تیار کر۔ بس کشتی علم کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بنائی گئی تھی۔ اگر کوئی شخص سوال کرے کہ نوحؑ کی کشتی تو اب تلک فلاں حکومت کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ میرا جواب یہ ہوگا کہ درست ہے لیکن اس آیت میں صرف اسی کشتی کا ذکر ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ: قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا

مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَاَهۡلَكَ (۱۱:۴۰)۔ ترجمہ: "ہم نے کہا چڑھا دے اسمیں کُل سے جفت دو اور اپنے اہل کو۔" یعنی نوحؑ نے جب دنیا کی ساری چیزوں کو حکمت کی نظر سے دیکھا اور ہر چیز میں صانعِ حکیم کی لاانتہا حکمتیں موجود پائیں اور کُل اشیاء میں حسبِ ترکیب روح موجود ہونے کی دلیل ثابت ہوئی اور اسے یہ بھی تحقیق ہوئی کہ عالمِ روحانی کی نورانیت میں یہ ساری چیزیں کس قدر باعثِ لذت نعمتیں بن سکتی ہیں۔ پھر حضرت نوحؑ نے غنیٔ مطلق کے حکم سے پانچوں حدوں سے جو امامِ زمان میں تھیں، ہر ایک جفتِ روحانی کو حاصل کر کے سفینۂ علم میں سما رکھی۔ یعنی حدِّ وحدتِ حدود (امرِ کُل) حدِّ عدل (عقلِ کُل) حدِّ ترکیب (نفسِ کُل) حدِّ تالیف (خود اس واقعہ کے بعد ناطق بنا) حدِّ تاویل (اساس) پھر عقل اور نفس والی ساری چیزیں جفت ہوئیں۔ یعنی عقل کی ساری چیزیں نر اور نفس کی ساری چیزیں مادہ تھیں۔ اس لئے وہ سب آپس میں جفت ہوئیں۔ جسے "زَوۡجَیۡنِ" کہتے ہیں۔ اسی طرح ناطق کی نر چیزیں اساس کی مادہ چیزوں کیساتھ جفت بن کر "اِثۡنَیۡنِ" کہلائیں۔ اور جو ارواح امر سے ملی تھیں وہ ایک چیز ہوئی۔ یعنی ان کا ایک وجود ہوا۔ یہی ہے شکر کی حقیقت جو حضرت نوحؑ نے کیا تھا۔

Spiritual World
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

رسولِ خداؐ کی وصیّت

حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی آخری وصیّت یہ تھی: اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِترَتِی اَھلَ بَیتِی۔ ترجمہ: "میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں۔ خدا کی کتاب اور امام"۔ خدا و رسول کا قول ہمیشہ حکمت خیز ہی ہوتا ہے۔ اس حدیث کی چند حکمتیں:-

پہلی حکمت

دو چیزوں میں سے ایک بدرجہ غایت مشکل کتاب ہے۔ دوسرا ہر مشکل کو نہایت ہی آسان بنا دینے والا شخص ہے۔ پھر جب مشکل کے ساتھ مشکل آسان بھی دیا جائے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ مشکل کا چارہ صرف مشکل کُشا ہی کرسکتا ہے۔ یعنی امام قرآن کی تاویل کا ذمّہ دار ہے۔

دوسری حکمت

حدیث کے ربطِ الفاظ میں پہلے کتاب ہے۔ پھر امام، اس قسم کے ربطِ الفاظ کا یہ اشارہ ہے کہ پہلے قُرآن تنزیل سے تم خود پڑھو۔ پھر اسکی تاویل امام سے ملے گی۔

تیسری حکمت

رسول، قرآن اور امام دونوں کو بھاری چیزیں بتاتا ہے۔ لیکن ظاہراً دیکھا گیا کہ قرآن شریف اس قدر ہلکا ہے کہ چھوٹا سا بچہ بھی اُسے اٹھا سکتا ہے۔ اور امام بھی جسمانی طور پر اوسطاً وہی وزن رکھتا ہے جو دوسرے انسان رکھتے ہیں۔ گو امام ہر ایک انسان سے ظاہراً زیادہ بھاری

ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ پھر اس صورت میں دونوں چیزوں میں سے ایک پر بھی انہیں بھاری بتانے کا قول صادق نہیں آسکتا ہے۔ اندر آن حال، ہم اپنی بھولی بھالی اور بیچاری عقلِ جزوی کو امامِ زمان کے حضور میں روانہ کرتے ہیں۔ تاکہ وہ وہاں اسکے بھاری پن کا کسی نہ کسی طرح تجربہ کرکے آئے۔ وہ عقل خام و ناتمام، ناکام واپس آتی ہے۔ کیونکہ بھاری پن سے یہاں اور کچھ مراد نہیں ہے، سوائے اسکے کہ انسانی عقل، بذاتِ خود قرآن کی تاویل حاصل نہیں کرسکتی ہے۔ اور نہ امامِ زمان کو پہچان سکتی ہے۔ اور لفظ "ثقلین" میں اس حدیث کا یہی فیصلہ ہے۔

چوتھی حکمت

لفظ "ثقلین" کے مباحث سے معلوم ہوا کہ قرآنِ شریف اور امامِ زمان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری حیثیت اور دوسری باطنی۔ اور یہ بھی دلیلاً ثبوت ہوا کہ ابتدا میں انسان کی عقلی رسائی ان دونوں کی باطنیت تک نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے ہم قرآنِ شریف اور امامِ زمان کو رسول کے حکم کے مطابق پہلے ظاہری طور پر مانیں گے یعنی کلی طور پر ہم امامِ زمان کی اطاعت کریں گے۔ اگر کوئی حقیقت پسند دانا اِس حدیث پر تبصرہ کرے تو امامِ زمان کی بے حد توانائی کا کچھ اندازہ کرسکتا ہے۔ اس چیز سے کہ کروڑوں انسانوں کی رہبری روحانی و جسمانی طور پر کرسکنے کے علاوہ خُدائے سبوح و قدوس کے اس کلامِ حکمت نظام کے جُملہ حقائق و اسرار سے باخبر ہونا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ پاکؐ نے قرآنِ شریف اور امامِ زمان کو بیک وقت و یک لفظ کس چیز کے تناسب سے بھاری کہا ہے۔ ان دونوں کی طاقت اور بھاری پن روحانی تھا۔ اِس لئے روحانی کا تناسب روحانی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا زمین آسمان سے بھی بھاری کہنا درست نہیں۔ کیونکہ ان کو بھی رُوح نے اٹھایا ہے۔ خداوندِ کریم فرماتا ہے": کہہ اگر جمع ہوویں آدمی اور جنّ اس پر کہ لادیں آیتِ قرآن۔ نہ لاسکیں گے آیت اگر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے بھی

رہیں۔" (۱۷:۸۸) معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم کی حقیقی تاویل جنّ جانتے ہیں نہ انس۔ پھر یہی تناسب ہے جس کی نسبت سے قرآن و علیٔ ہر زمان کو عقل کے لحاظ سے بھاری کہا گیا ہے۔ یہاں فیصلہ یہ ہوا کہ جنّ و انس کا کوئی فرد قرآن کی پوری حقیقت نہیں جانتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص عالم القرآن ہو، جس کی خدائی شہادت مل سکتی ہو تو وہ شخص دلیلاً نہ جنّ میں سے ہے اور نہ انس میں سے۔ جب ایسا شخص جنّ و انس سے نہ ہو تو محکم دلیل ہے کہ وہ فرشتۂ جمالی بھی نہیں بلکہ فرشتۂ جلالی ہے۔ وہ شخص جو فرشتہ ہے۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۱۳:۴۳) یہی امامِ زمان اپنے تابعین کے لئے باقتضائے زمانہ اعمال کا وہ طریق مقرر کرتا ہے جو قرآنِ پاک کی اس گہری حکمت کے بعینہٖ مطابق ہو۔ تاکہ انہیں بالکل تاویل کے قریب رہنا پڑے۔

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اصلُ الاصُول

اللّٰھُمَّ یَامَوْلَانَا یَاعَلِی مَدَدْ

طالبانِ حقیقتِ اسماعیلیت سے مخفی نہ رہے کہ اس مقدّس مذہب کی اصلُ الاصُول "امرِکُل" یعنی کلمۂ باریٔ سبحانہٗ ہے جو مختلف اسماء سے موسوم ہے۔ چنانچہ امرِکُن (کاف ونون)، وحدت، مُبدع، بہشتِ حقیقی، معاد وغیرہ باری سبحانہٗ نے اسی امرِکُل کے کلمۂ واحدہ سے بمثلِ عقلِ کُل موجود کیا۔ جو کہ ہماندم کلمۂ کُن میں مل کر ایک ہوَا۔ امرِکُل کے معنوں میں سے ایک معنیٰ حکم یعنی فرمان ہے۔ اسلئے اگرچہ عالمِ امر کے لئے ایک ہی کلمۂ فرمان کافی تھا لیکن عالمِ خلق کیلئے ہمیشہ امر کی ضرورت پڑنے کی وجہ سے فرمانِ امامِ زمان امرِکُل کا مظہر ہوَا۔ امرِکُل کی روحانی عمل گاہ انسانی ارادہ ہے۔

اُصولِ دین

اُصولِ دین چار ہیں، عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس۔ ان میں سے دو اصل عقلِ کُل اور نفسِ کُل روحانی ہیں۔ دو اصل ناطق اور اساس جسمانی ہیں۔

اُصول کے معنی درخت کی جڑیں ہیں یعنی دین کے درخت جس کا ذکر اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴:۲۴-۲۵)۔ اللہ تعالیٰ حقیقت شناسوں کی تعلیم کیلئے اپنے پیارے رسول حضرت محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے مخاطب ہوکر یوں فرماتا ہے کہ: "آیا اے محمّد! تو نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پاک کلمہ کی مثال کس طرح بیان فرمائی ہے (وہ کلمہ) ایک پاک درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اسکی شاخ آسمان میں ہے۔ پھل دیتا ہے ہر موسم میں اپنے پروردگار کے حکم سے۔ اور اللہ لوگوں کو مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ علمی ذکر کریں"۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیتِ شریفہ میں دو پاک چیزوں کا ذکر ہے جو کہ نفع رسانی اور ہر صفت میں ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ یعنی جو صفت اس پاک درخت میں موجود ہے وہ صفت اس پاک کلمہ میں بھی موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو پاک کلمے کا ذکر چھیڑا، پھر اس کی مثال پاک درخت سے دی۔ اور عقل مندوں کیلئے

واضح کر دیا کہ جس طرح پاک درخت ہر وقت اور ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے۔ اسی طرح پاک کلمہ بھی عرفانی منفعت بخشتا ہے۔ اب آپ ذرا غور کر کے یہ بتائیے کہ دنیا میں کہیں ایسا درخت بھی ہے جو ازل سے اپنی جڑوں پر مضبوطی سے کھڑا رہتا ہو۔ اور اَبد تک کبھی نہیں گرتا ہو اور اسکی شاخیں آسمان میں جا لگی ہوں۔ جس کے پھل پکنے کی کوئی دیر اور کوئی موسم نہ ہو۔ بلکہ ہر سال، ہر ماہ، ہر روز، ہر ساعت، ہر منٹ اور ہر سیکنڈ پکا ہوا میوہ تیار رہو۔ میوہ بھی کبھی ختم نہ ہو، آپ ہرگز یہ نہیں بتا سکیں گے کہ دنیا میں فلاں جگہ اس قسم کا ایک درخت ہے۔ پس سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا درخت نہیں۔ بلکہ یہ ایک مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی فرماتا ہے کہ یہ لوگوں کو سمجھانے کی ایک مثال ہے۔ پس اس کا ممثول یہ ہے کہ یہ پاک کلمہ، کلمۂ باری سبحانہٗ ہے، جس کا ذکر بطریقِ اختصار ہو چکا۔ اور یہ درخت شجرۂ نبوّت و امامت ہے، یعنی درختِ دین جس کے چار اصولوں کا ذکر کیا گیا۔ اب اسی درخت کی شاخوں کا ذِکر سنئیے!

فُروعِ دین

فُروعِ دین چھ ہیں: جدّ، فتح، خیال، امام، حجّت، داعی۔ ان میں سے تین فرع: جدّ، فتح اور خیال روحانی ہیں۔ اور تین فرع: امام، حجّت اور داعی جسمانی ہیں۔ جدّ اسرافیل، فتح میکائیل اور خیال جبرائیل کے نام ہیں۔ امام سے مراد امامِ زمان، حجّت کا مطلب اٹھائیس حجتوں میں سب سے بڑا یعنی باب یا امام کا وہ فرزند جو لاحقِ نور ہو اور داعی سے مراد تین سو ساٹھ داعیوں میں سے وہ داعی ہے جو حجّتِ اعظم کا لاحق ہو۔

اُصولِ دین کی تشریح

اصلِ اوّل عقلِ کُل

عقلِ کُل کے مختلف نام: آدمِ حقیقی، علّتِ اولیٰ، عرشِ الٰہی، قلم، اوّل، خزینۂ الٰہی، ملکِ خدا، مجوہر الجواہر، عالّ اور حمد وغیرہ۔

عقلِ کُل اس فرشتے کو اس لئے کہتے ہیں کہ عقل اور علم کا یہی سرچشمہ ہے اور تمام عقول اور علوم اس کے نیچے ہیں، کوئی شے ایسی نہیں جو یہ نہ جان سکے۔ کوئی علم اس سے باہر نہیں، تمام اشیاء پر یہ محیط ہے۔ آدمِ حقیقی اسلئے کہتے ہیں کہ یہ علمُ الاسماء کے عالم اور کُل فرشتوں کا مسجود ہے۔ علّتِ اولیٰ اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ موجود ہوا، اور اس سے دوسرے موجودات، یعنی نفسِ کُل اور اس کے ذریعے تمام موجودات پیدا ہوئیں۔ اس کو عرشِ الٰہی اسلئے کہتے ہیں کہ کوئی موجود اس سے بڑھ کر اشرف اور افضل نہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کا تخت بننے کے لائق ہو سکے سوائے عقلِ کُل کے، اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ کا یہ مستقر اور تخت ہے۔ قلم اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعے سے علم سکھایا "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ"۔ اوّل اسلئے کہتے ہیں کہ اسکی خلقت سب سے پہلے ہوئی۔ حدیث: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْقَلَمُ؛ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْعَقْلُ؛ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی نُوْرِیْ۔ اسے خزینہ اسلئے کہتے ہیں کہ اسمیں سب چیزیں موجود ہیں۔ اَوْ یُلْقٰی اِلَیْہِ کَنْزٌ (۸:۲۵)۔ ترجمہ: "یا کیوں

نہ ڈالا گیا اس پر کوئی خزینہ"۔ یعنی اس کو کیوں عقلِ کُل سے تائید نہیں ملتی ہے۔ اسے ملکِ خدا یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اس لئے کہتے ہیں کہ ملکِ خدا میں کوئی تفاوت نہیں پائی جاتی۔ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷:۳)۔ پس اس میں کوئی تفاوت نہیں۔ مجوہر الجواہر اس لئے کہتے ہیں کہ جواہرِ علوی و سفلی کو اسی نے جوہر بنایا ہے۔ عالّ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ علّت کا بانی ہے۔ یعنی علّت بنانے والا ہے۔ حمّاس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تحمید و تعریف و ستائش اسی سے ہوتی ہے۔

اصلِ دُوم نفسِ کُل

نفسِ کُل وہ فرشتہ ہے جو تمام نفوس و ارواح کیلئے مخرج اور مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ حوائے معنیٰ ہونے کی وجہ سے یہ عقلِ کُل کی جفت ہے۔ اسے کرسی کہتے ہیں: وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ترجمہ: "اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔" (۲:۲۵۵)۔ آسمانوں اور زمینوں کو نفسِ کُل نے اپنی وسعت میں سمو کر گھیر لیا ہے۔ لوحِ محفوظ اسے اس لئے کہتے ہیں کہ عقل کے قلم سے لکھے ہوئے صنعت کے نقوش نفسِ کُل میں ہمیشہ محفوظ ہیں۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ لا فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵:۲۱-۲۲)۔ یعنی "بلکہ وہ باعظمت قرآن ہے ایک محفوظ تختے میں۔" یعنی نفسِ کُل میں جو ہر چیز کے حفاظتی تختہ کی حیثیت رکھتا ہے اسے نفسِ واحدہ بھی کہتے ہیں۔ یعنی ایک نفس یا کہ نفوس کو ایک کرنے والا۔ اسکے اور بھی بہت سے نام ہیں لیکن اس قدر تشریح کفایہ ہوگی۔

اصلِ سوم ناطق

ہر دَور میں جو چھ ہزار سال کا ہو چھ ناطق ہوتے ہیں۔ اس دَور کے ناطقوں کے نام یہ ہیں: آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔ آخری ناطق حضرت محمّدؐ ہیں۔ ناطق

کے لغوی معنی گوینده یعنی بولنے والے کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ دین میں ناطق اس نبیٔ مرسل کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب نازل ہوئی ہو۔ اور اللہ کے حکم سے اُس نے اُس کتاب کے مطابق اپنی نئی شریعت کے ذریعہ سے اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہو۔ خدا تعالیٰ اپنے پیارے ناطق کے بارے میں فرماتا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳: ۳-۴)۔ یعنی "وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ وہ اور کچھ نہیں مگر اسے وحی نازل ہوتی ہے۔" اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳: ۶۲)۔ یعنی "ہمارے پاس ایک ایسی کتاب بھی ہے جو بغیر کسی کے پڑھے وہ خود سچائی سے بولتی ہے۔" ایسی خود بولنے والی کتابِ ناطق یعنی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں۔

اصلِ چہارم اساس

اساس بنیاد کا نام ہے۔ اور اصطلاحِ دین میں حضرت مولانا مرتضیٰ علیؑ کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ امامت انہیں سے ظاہر ہوئی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے [مولانا علیؑ سے] فرمایا کہ: اَنْتَ مَعَ الْاَنْبِيَاءِ سِرًّا وَمَعِيَ جَهْرًا۔ یعنی مولانا علیؑ تمام پیغمبروں کے ساتھ تھے مگر عوام النّاس ان کو نہیں جانتے تھے لیکن حضرت محمدؐ کے زمانے میں آشکار ہوئے۔ اساس کو صدّیق بھی کہتے ہیں۔ صدّیق کے معنی ہیں تصدیق کرنے والا۔ اس لئے کہ مولانا علیؑ اپنی تاویل سے حضرت محمدؐ کی تنزیل کی تصدیق کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اسی بارے میں فرمایا کہ: يَا عَلِيُّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى۔ یعنی آپ میرے لئے ایسے ہیں جیسے ہارون موسیٰ کے لئے تھے۔ اور موسیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قولہٗ تعالیٰ: وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (۲۸: ۳۴)۔ یعنی موسیٰ نے کہا کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ خوش بیان ہے پس اسکو میرے

ISW IS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

ساتھ مدد کیلئے بھیج دے تا کہ وہ میری تصدیق کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیا کریں گے، یعنی فرعون اور اسکی قوم۔ پھر خدائے تعالیٰ اور اسکے رسول کے قول سے یہ ثابت ہوا کہ مولانا علیؑ ہر طرح سے رسول اللہ کی مدد اور اسکی تنزیل کی تصدیق کرنے والے تھے۔ شریعت اور تنزیل کی تصدیق صرف تاویل سے ہوسکتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا: اِنَّ مِنۡکُمۡ مَنۡ یُقَاتِلُ بَعۡدِیۡ عَلَی التَّأۡوِیۡلِ کَمَا قَاتَلۡتُ عَلَی التَّنۡزِیۡلِ فَسُئِلَ النَّبِیُّ مَنۡ ھُوَ فَقَالَ خَاصِفُ النَّعۡلِ یَعۡنِیۡ اَمِیۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ حضرت نبی کریم محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنے صحابۂ کرام سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے کہ "تم میں وہ شخص بھی ہے۔ جو کہ میرے بعد تاویل پر لڑے گا، جسطرح میں تنزیل پر لڑا تھا"۔ پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے دریافت کیا گیا کہ "وہ شخص کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا کہ "وہی شخص جو تمہارے سامنے جوتے ٹھیک کر رہا ہے یعنی امیر المومنین"۔

کوئی بھی عاقل اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ کسی چیز کی تصدیق اس وقت بحقیقت ہوسکتی ہے جب اس چیز کی پوری اصلیت معلوم ہو جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَکَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ ۙ وَمَا بَلَغُوۡا مِعۡشَارَ مَآ اٰتَیۡنٰھُمۡ فَکَذَّبُوۡا رُسُلِیۡ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ (۳۴:۴۵)۔ ترجمہ: اور جھٹلایا ان سے اگلوں نے بھی اور وہ نہ پہنچے تھے اس چیز کے دسویں حصّے تک جو ہم نے ان کو دی تھی۔ یعنی "کتاب" پھر اس وجہ سے انھوں نے ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ پھر کیسی ناشناسی تھی۔ نَکِیۡر بروزن فَعِیل یعنی فاعل برابر شں نَاکِر ضِد عارف بمعنیٰ ناشناس۔

اس آیت کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ ظاہرًا آسمانی کتاب کو تو پڑھتے تھے لیکن کتاب کی حقیقت یا تاویل کی نسبت سے ان کی رسائی کم از کم اتنی بھی نہ تھی کہ وہ تاویل کے دسویں حصہ تک پہنچ سکے۔ پھر یہی ان کی نارسائی حقیقتًا ان سے اپنے پیغمبروں کی تکذیب ہوئی۔

بہرحال خدا اور رسولؐ کے اقوال کی تاویل کیلئے مولانا مرتضیٰ علیؑ اساس تھے اور ہر وقت بہ لباسِ دیگر و باسمِ دیگر دنیا میں حاضر ہیں۔ جو کچھ وہ فرماتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہی تاویل ہے، کیونکہ یہی قرآنِ مجید روحانی خصوصیت کے ساتھ امامِ زمان کی ذاتِ والاصفات میں ہمیشہ موجود ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا قول: اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ وَّعَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ۔ ترجمہ: "قرآن علی کیساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ ہے۔" اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولانا علیؑ ہر وقت قرآنِ شریف کو اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں، بلکہ اس کی اصلیت کچھ اور طرح کی ہے۔ اس حدیث کی مثال سے آپ اس مطلب کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ "یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔" اگر واقعی علیؑ بابِ نبیؐ ہے تو علیؑ کے اندر نبیؐ بھی ہے اور وہ تمام علوم بھی ہیں جو آنحضرتؐ ہی جانتے تھے۔ کیونکہ شہر تو دروازہ کے اندر ہوتا ہے اور اسکے بغیر کوئی شخص شہر میں داخل نہیں ہوسکتا ہے۔ نیز دروازہ کسی شہر کا اس وقت ہوتا ہے، جبکہ ہر شخص کو اپنے اختیار سے شہر میں داخل نہ ہونے دینا مقصود ہو۔ اس صورت میں شہر کے گرداگرد ایک مضبوط فصیل بھی ہوتی ہے۔ میں کہوں گا کہ اس شہر کی فصیل بھی مرتضیٰ علیؑ ہیں۔ یعنی وہ تمام حقائق و معارف جو رسولؐ کے پاس تھے وہ سب علیؑ کی ذاتِ شریف میں موجود ہیں۔ کیونکہ رسولؐ بھولنے والوں میں سے نہیں اور جملہ قرآنِ مجید اس کے مبارک دل میں موجود تھا: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷:۶)۔ "یعنی قرآنِ مجید ہم تمہیں پڑھ کر سنائیں گے اور تو ہرگز اسے نہیں بھولے گا۔" پھر جب علیؑ کے نور میں محمدؐ کا نور موجود ہے اور علیؑ کا نور امامِ زمانؑ میں ہے تو یقینی ہے کہ قرآنِ مجید بھی اس نور میں ضرور موجود ہے۔ اس مثال کی حقیقت اسی طرح سمجھنا رسول اللہؐ کے حق میں بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کوئی شخص اس علم و حقائق سے معمور شدہ شہر کو اجاڑ تصوّر کرے۔ یہ اس لئے کہ خدا اور اسکے

رسولؐ کو یہ ہرگز زیبا نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کی تعریف و توصیف کریں جو چند دنوں کے بعد فنا ہونے والی ہو۔

پھر یہی حقیقت مکرّر بتلائی جاتی ہے کہ علیؑ اساس اور تاویل کے مالک بحالِ یک نوری امامِ زمانؑ میں موجود ہے اور وہ اب بھی بالکل اسی طرح شہرِ علمِ کا دروازہ ہیں جس طرح پہلے تھے۔ مولانا مرتضیٰ علیؑ اپنے ایک خطبہ میں یوں فرماتے ہیں کہ "اگر میں موت سے مروں تو ہرگز نہیں مرتا۔ اور اگر مجھے قتل کر دیا جائے تو میں ہرگز نہیں قتل ہوتا ہوں"۔ اس خطبے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مولانا علیؑ اپنے جسمِ مبارک کو لافانی قرار دیتے ہیں، کیونکہ کوئی بھی جسم غیر فانی نہیں اور ان کے بیان کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ عالمِ روحانی میں زندہ ہیں۔ کیونکہ وہاں والے تو سب زندہ ہیں اور جو صفت سب میں پائی جاتی ہے دانا شخص اس پر فخر نہیں کرتا۔ لیکن جب چاہے کہ اپنی خصوصیات سے لوگوں کو آگاہ کرے تو وہ خصوصیات ظاہر کرتا ہے جو دوسروں میں موجود نہ ہو۔

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

فُروعِ دین کی تشریح

فرعِ اوّل جدّ جدّ اسرافیل کا نام ہے۔ قرآنِ مجید کی اس آیت میں اس کا کچھ ذکر ہے: وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۷۲:۳)۔ "اور یہ کہ بہت بلند ہے ہمارے پروردگار کا وہ فرشتہ جس کا نام جدّ ہے۔" اسی طرح دعائے قنوت میں رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جدّ کی بلندی بیان فرماتے ہیں: سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَجَلَّ ثَنَاؤُکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ ترجمہ: بارِ خدایا تو پاک ہے اور حدِ اوّل سے ہی تیرے لائق تحمید ہوسکتی ہے اور حدِ ثانی سے جو تیرا نام ہے تیری معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور حدِ ثالث یعنی جدّ سے تیری برتری کا اقرار کیا جاسکتا ہے اور رابع سے تیری بزرگی عیان ہے اور خامس پر تیری عبادت قبول ہو جاتی ہے اور اللہ حدودِ روحانی اور جسمانی سے بہت بڑا ہے۔ اس بیان کا خاص مطلب جدّ کا ذکر ہے۔

چونکہ جدّ فروعِ روحانی میں سے بالاترین فرع ہے۔ نیز یہ فرشتہ عشقِ حقیقی ہے۔ لہٰذا اسے برتر قرار دیا گیا ہے۔ ازانکہ درخت کے تنا سے شاخ بالاتر ہوتی ہے، لیکن اس کا قیام تنا پر ہے۔ پس بلاشک معلوم ہو کہ جس وجہ سے ان تین فرشتوں کو درختِ دین کی شاخیں مان لیتے ہیں اسی وجہ سے جدّ برتر ہے۔ اس فرشتے کا فیضِ عام ہر انسان کیلئے قوتِ نطق ہے۔

فرعِ دُوُم فتح میکائیل کا دوسرا نام فتح ہے۔ فتح کے معنی کھولنا۔کشُودن ہے، یعنی کسی بھی بند چیز کو کھولنا۔لیکن یہاں اس فتح سے مراد روحانی کشودہی ہے۔اس کا مصداق یہ آیۂ شریفہ ہے: قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ وَھُوَالْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ (۳۴:۲۶)۔ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو جمع کرے گا۔ پھر کھولے گا ہمارے درمیان سچائی سے۔اور وہ کھولنے والا جاننے والا ہے۔" یہاں جمع کرنے سے مراد دینِ محمّدی میں داخل ہونا اور کھولنے سے مراد تنزیل کو تاویل میں بیان کرنا ہے۔ پس فتح یعنی میکائیل کی حدّ سے تاویل شروع ہوتی ہے۔چنانچہ یہ قول مشہور ہے کہ میکائیل دنیا والوں کو رزق تقسیم کرنے والا فرشتہ ہے۔ پھر درست ہے کہ رزق دو طرح کا ہوتا ہے۔جسمانی اور روحانی۔ روحانی رزق تاویل ہے اور تاویل کی حدِّ غایت فتح یعنی میکائیل ہے۔عام حالت میں ہر انسان کو اس فرشتہ سے قوتِ فہم ملتی ہے۔

فرعِ سوم خیال خیال جبرائیل کو کہتے ہیں اور یہ تنزیل کا فرشتہ ہے، اور اس کو خیال اسلئے کہتے ہیں کہ اس کا روحانی عمل انسانی تخیل میں ہوتا ہے۔ طالبِ روحانیت کے تخیل سے حجابِ ظلماتی کا اٹھانا اسی فرشتے کا کام ہے۔جس طرح انسانی مدرِکات کی ترتیب میں حواسِ خمسۂ ظاہری کے بعد خیال ہے، جو کہ وہ مدرِکۂ خمسۂ باطنی کی پہلی مدرِکہ ہے۔اسی طرح پنج حدِّ جسمانی کے بعد فرشتۂ خیال ہے۔ جو کہ وہ پنج حدِّ روحانی کی پہلی حدّ ہے یعنی روحانیت خیال سے شروع ہوتی ہے۔جبرائیل کے متعلق مزید تفصیل اس آیۂ شریفہ سے مل سکتی ہے۔قولہٗ تعالیٰ: قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۲:۹۷)۔ترجمہ: "کہہ جو کوئی جبرائیل کا دشمن ہو، حالانکہ اس نے اللہ کے اذن سے تیرے دل پر اتاری ہے اُس چیز کو جس پر پہلی چیز کی

تصدیق ہوسکتی ہے اور مومنوں کیلئے اس میں راہ یابی و خوشخبری ہے۔" اس آیت میں جبرائیل سے دشمنی رکھنے کے نقصاناتِ روحانی بیان کئے ہیں۔ ظاہری طور پر جبرائیل سے کسی کی دشمنی ممکن نہیں۔ فی المثل اگر کافروں کے متعلق یہ ٹھہرائیں کہ کافر لوگ جبرائیل کے دشمن اسلئے ہوتے تھے کہ وہ خدائے تعالیٰ سے حضرت محمدؐ پر وحی نازل کرتا ہے۔ پھر یہ بات محال ہوگی۔ کیونکہ اس قسم کی بات میں خدا کی ہستی اور جبرائیل کے واسطے سے حضرت محمدؐ پر وحی نازل ہونے کیلئے اقرار ہے۔ اسی طرح جو لوگ خدا کی ہستی کو نہیں مانتے انہیں از روئے قانونِ منطق خدا کے دشمن نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے دوستی یا دشمنی رکھنے سے پہلے اس چیز کی ہستی کیلئے اقرار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً زید نے کہا کہ "بکر میرا دشمن ہے یا میں بکر کا دشمن ہوں"۔ تو اس جملہ میں سب سے پہلے زید اپنے دشمن بکر کی ہستی کا، پھر اسکے فعل کا اور آخر میں مخالفت کا اقرار کرتا ہے۔

پھر جبرائیل سے دشمنی کی حقیقت اسی طرح ہے کہ کوئی شخص ایسے اعمال کا مرتکب ہو جائے جن کی وجہ سے اس شخص کے دل میں جبرائیل کے روحانی فعل وقوع میں نہ آسکے۔ خواہ اس شخص کے بُرے اعمال کی وجہ کچھ بھی ہو۔ اس صورت میں مثال کے طور پر جبرائیل اس سے دُور رہے گا۔ دور رہنا اور بھاگنا دشمنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دشمنی ان معنوں پر حاوی ہے۔ کسی چیز کا بُرا لگنا، اسے نہ چاہنا، اپنا مخالف سمجھنا، اسے ختم یا اپنا تابع کرنے کیلئے کوشش کرنا، اس سے گریز کرنا، اور دل میں ہر قسم کے بُرے اندیشے رکھنا وغیرہ۔ لیکن فرشتے ان چیزوں سے پاک ہوتے ہیں۔ فرشتوں کا فعل اسی طرح پاک ہے جس طرح سورج آسمان پر سے روشنی ڈالتا ہے ہر اس چیز پر جو سورج سے اپنے آپ کو نہ چھپاتا ہو اور جو چیز اپنے لئے کوئی پردہ بنا کر اس پردہ میں رہتا ہو تو وہ چیز اپنے دشمن ہونے کی وجہ سے سورج کا بھی دشمن ہے۔ کیونکہ وہ چیز سورج سے دور رہتی ہے اور ان تمام الفاظ کا اس پر اطلاق ہوتا

ہے جو دشمنی کے معنی میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دوسرے فرشتوں سے پہلے ہی جبرائیل سے دشمنی رکھنے کی مذمت بطریقِ حکمت بیان فرمائی معلوم ہوا کہ مومنوں سے عملاً جبرائیل کی دوستی چاہتا ہے۔اس کی وجہ جملہ وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ روحانیت اور معرفتِ نفس جو کہ پروردگار ہی کی معرفت ہے،اور اس کا پہلا دروازہ روحانی لحاظ سے خیال یعنی جبرائیل ہے، اس لئے مومنوں کیلئے ضروری ہے کہ اسی زندگی میں ہی کم ازکم ایک دفعہ روحانیت کی ہستی کو ماننے کیلئے اس فرشتہ کی دوستی سے عملاً فیض حاصل کریں، اور یہ کام ناممکن نہیں۔بلکہ اس کی امکانیت اس آیت کے لفظ "ہدایت اور بشارت" میں موجود ہے۔نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "جبرائیل نے تو تیرے دل پر وحی نازل کی ہے"، دل کی حقیقت جاننے اور اُسے ہر قسم کی آلائشوں سے صاف رکھنے کا اشارہ ہے۔مثلاً اگر کوئی شخص یہ سنے کہ بادشاہ یا اور کوئی عزت مند بزرگ اُس کے گھر آنے والا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے مکان کو صاف اور آراستہ کرنے کیلئے کوشش کرے گا۔اور اس بات کا بھی خیال رکھے گا کہ گھر کے اندر کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے اس عزیز مہمان کو نفرت ہو۔

علاوہ ازیں اس قسم کی روحانیت حاصل کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تمہیں رسول کی چال سیکھنی اچھی تھی۔جو کوئی اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے"۔(۳۳:۲۱)۔یعنی جس طرح رسولؐ روحانیت میں تمہارے آگے چلتا تھا،تمہیں بھی اسکے پیچھے چلنا سیکھنا اچھا تھا۔اور یہ اُس شخص کے لئے ہے جو اللہ اور روحانیت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔یوم الآخر کا ترجمہ روحانیت سے کیا گیا ہے۔کیونکہ روحانیت ہی میں یوم الآخر موجود ہے۔اس آیت میں بھی روحانیت حاصل کرنے کی امکانیت اور اس کے شرائط ہیں۔

فرعِ چہارم امام

فروعِ جسمانی میں سب سے اوّل امام ہے۔ امام کے چھوٹے اور بڑے بہت سے مراتب ہیں، جن کا مفصّل بیان اسی کتاب کے ایک علیحدہ باب میں کیا جائے گا۔ امام کے معنی پیشوا، سردار، ہر چیز کی اصل اور دینی امور میں آگے رہنے والا وغیرہ ہیں۔ اگرچہ عقلِ کُل نفسِ کُل، ناطق اور اساس کو دین کے درخت کی جڑوں کی حیثیت سے اور امام کو اس درخت کی شاخ کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ تسلیم ہے کہ پھل صرف درخت کی شاخوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ شاخ کی وابستگی تو تنا اور جڑوں سے ضرور ہے مگر میوہ شاخ میں لگتا ہے، یعنی درخت کے اتحادی عمل کا نتیجہ اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ درخت کی شاخ پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح امامِ زمان ہے جسکے علمِ تاویل سے عقلِ کُل نفسِ کُل، ناطق اور اساس کی شرافت و عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نیز جسطرح درخت کے پھل لانے کا عمل اُسکی شاخ میں ظہور ہوتا ہے اسی طرح چار اصول یعنی عقلِ کُل نفسِ کُل، ناطق اور اساس کے روحانی عمل بھی امامِ زمان ہی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ امامِ زمان ہمیشہ دنیا میں موجود اور حاضر ہے۔ اور ہر زمانہ میں امامِ زمان روحانی و جسمانی طریقے پر دنیا والوں کو علیٰ حسبُ المراتب فیض بخشتا ہے۔ روحانی فروع یعنی جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل سے بلا واسطہ فیض حاصل کرنا دشوار ہے، اس لئے امامِ زمان کی اطاعت کرنا ضروری ہے، تاکہ اس واسطہ سے روحانیت آسانی سے حاصل ہوسکے جسمیں پہلے علمِ حدود پھر علمِ توحید کا دروازہ کھلنا ممکن ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵:۳۵)۔ ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک وسیلہ ڈھونڈو، اور جدوجہد کرو اسکی راہ میں، تاکہ تم رستگار ہو جاؤ۔"

شکل تمثیلیٔ اصول و فروعِ دین بخطوطِ وحدانی

برائے تفہیم یکیٔ ہمگیٔ حُدود اندر امرِ کُل و نسبتہائے ہمجنسی و ترکیبی و مقابلتیٔ ہریک:

دربیانِ نعمتِ ظاہری و باطنی قولہٗ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ (۳۱:۲۰)۔ ترجمہ: "کیا تم

نے نہیں دیکھا؟ کہ اللہ تعالیٰ نے کام پر لگائے تمہارے، جو کچھ ہیں آسمان و زمین میں۔ اور بھر دی تم کو اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔ اور بعض آدمی ایسے ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کے بارے میں۔ نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ۔ نہ کتاب چمکتی۔"

شکلِ تمثیلی عالمِ عُلوی، عالمِ سفلی و عالمِ دین

شکلِ تمثیلیٔ عالمِ عُلوی، عالمِ سفلی و عالمِ دین برائے تفہیمِ فیض رسانی اصول و فروعِ دینِ ہر سہ عالم مانندِ درختِ چہار بیخ و شش شاخ:

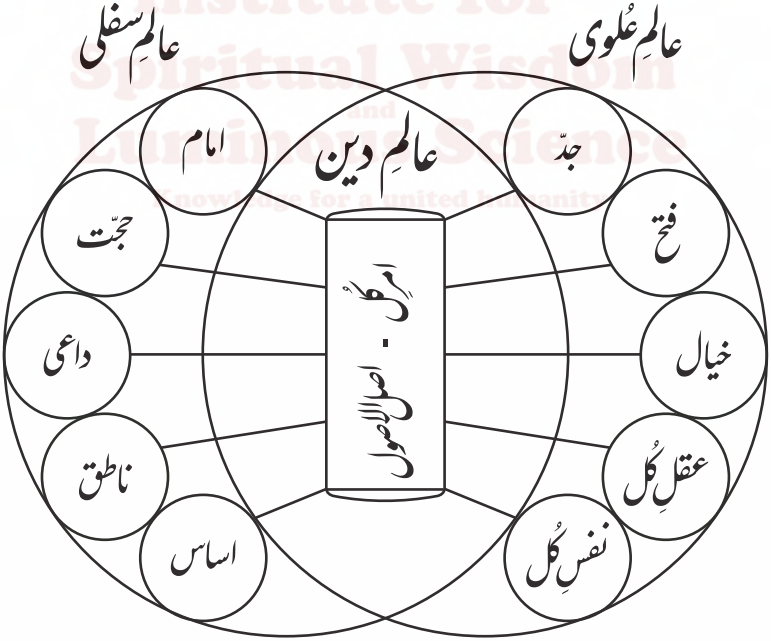

شکلِ تمثیلی بروجِ عالمِ دین

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ (۱۵: ۱۶-۱۷)۔

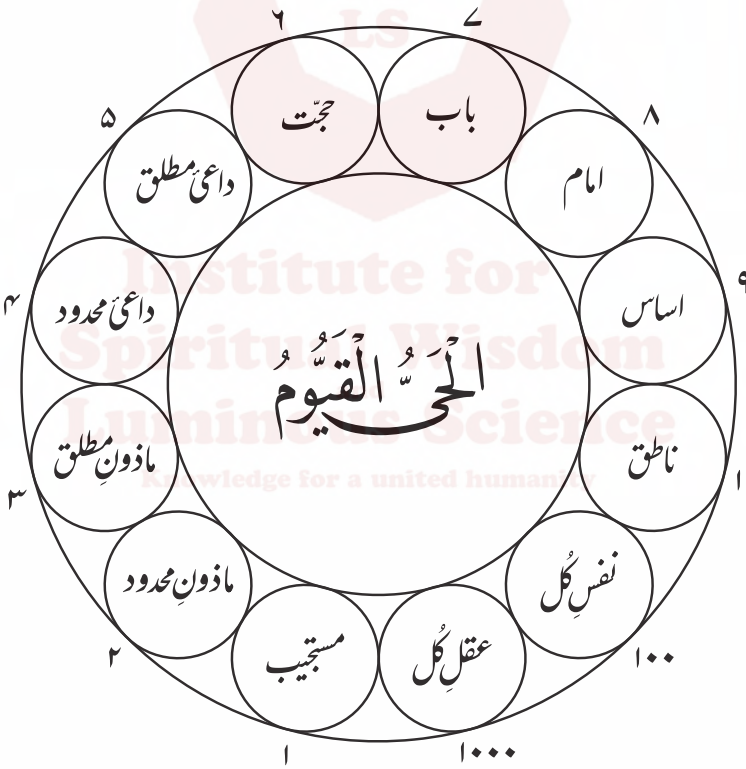

ترجمہ: "اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اسکو دیکھنے والوں کیلئے اور بچا رکھا اس کو ہر شیطانِ رجیم سے۔"

عددِ تعین	حدودِ دوازده گانه	ترکیبِ عالم	مرتبت حدود	جملہ اماماں از آدم تا این زمان
۱	مستجیب	خاک	استجابت	۷ امامانِ دَورِ آدم علیہ السّلام
۲	ماذونِ محدود	آب	اذن	۷ امامانِ دَورِ نوح علیہ السّلام
۳	ماذونِ مطلق	ہَوا	اذن	۷ امامانِ دَورِ ابراہیم علیہ السّلام
۴	داعئ محدود	آتش	دعوت	۷ امامانِ دَورِ موسیٰ علیہ السّلام
۵	داعئ مطلق	فلکِ اوّل قمر	دعوت	۷ امامانِ دَورِ عیسیٰ علیہ السّلام
۶	حجّت	فلکِ دوم عطارد	حجتی	۷ امامانِ دَورِ محمّد صلعم
۷	باب	فلکِ سوم زہرہ	بابیت	۷ امامانِ عصرِ دُوم
۸	امام	فلکِ چہارم شمس	خیال	۷ امامانِ عصرِ سُوم
۹	اساس	فلکِ پنجم مریخ	فتح	۷ امامانِ عصرِ چہارم
۱۰	ناطق	فلکِ ششم مشتری	جدّ	۷ امامانِ عصرِ پنجم
۱۱	نفسِ کُلّ	فلکِ ہفتم زحل	لوح	۷ امامانِ عصرِ ششم
۱۲	عقلِ کُلّ	فلکِ ہشتم ثوابت	قلم	۷ امامانِ عصرِ ہفتم
۱۳	امرِ کُلّ	فلکِ نہم	ہویّت	....

۸۴ / ۱۲ ۷ چراکہ در ہفتم امام

تمام است ہمین دوازدہ شہر است کہ گفت خدائے تعالیٰ من زمین آسمانہا را در دوازدہ ماہ آفریدہ ام :-

شکل ترکیب عالم و مراتب دین برائے تفہیم آنکہ عالم دین و این جہان بر مثال یکدیگر اند

وحدانیت باری سبحانہٗ وتعالیٰ

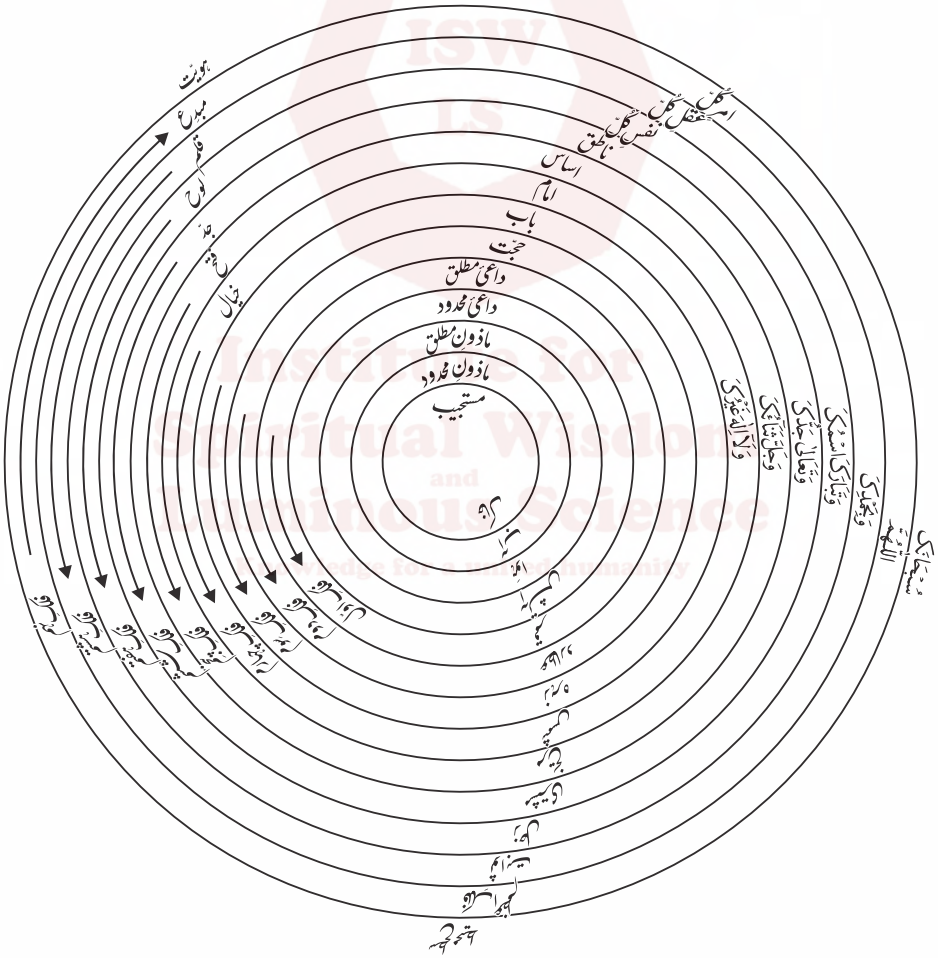

فرعِ پنجم حجّت

حجّت دلیل کو کہتے ہیں۔ یعنی مناظرے یا بحث میں حقانیت پر کسی چیز کو نفی یا اثبات کرنے کیلئے جو معقول بات ہو اسے حجّت کہتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (۶:۱۴۹)۔ یعنی "پکی دلیل اللہ کی ہے۔"

حجّت کو حجّت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ نفی اور اثبات کی دلیلیں کُلی طور پر جانتا ہے اور کبھی بھی کسی مناظرے میں عاجز نہیں ہوتا اسلئے کہ علمِ تاویل جانتا ہے۔ حجّت کے دوسرے معنی علمی جنگ یعنی بحث ہے۔ اور تیسرے معنی وہ شخص جو کسی کی طرف سے جواب دہی کی ذمّہ داری رکھتا ہو۔ چنانچہ قرآنِ شریف کی یہ آیت: لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ (۴۲:۱۵) کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی قولی جھگڑا نہیں۔" دوسرے معنی میں آئی ہے: رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴:۱۶۵)۔ ترجمہ: "بہت سے پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، تاکہ لوگوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر پیغمبروں کے بھیجے جانے کے بعد کوئی جواب دہی کی ذمّہ داری نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔"

یعنی ہر زمانے میں یہی عمل جاری رکھتا ہے۔ اس آیت میں حجّت کے تیسرے معنی مراد ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن کسی کی یہ شکایت نہیں ہوگی کہ ہمارے زمانے میں کوئی رسول یا ہادی نہیں تھا جو زمانے کے مطابق ہمیں راستہ دکھاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ظاہر کیا ہے کہ دین اور دنیا میں اسے جو کچھ ذرائع اور اسباب پیدا کرنا تھا وہ لوگوں کیلئے مہیا کر کے رکھا ہے، یعنی اسکی طرف سے لوگوں پر حجّت ہے یعنی امامِ زمانہ دنیا میں ہمیشہ اس لئے ہے کہ فردائے قیامت خدا تعالیٰ پر لوگوں کی حجّت نہ ہو۔

پس معلوم ہوا کہ خدا و رسول کی طرف سے حجّت لوگوں کے لئے امامِ زمان ہے اور یہ امام کے اختیار میں ہے کہ وہ بذاتِ خود دینی نظام چلائے یا حجّتوں اور داعیوں کے واسطے سے چلائے۔ یہاں صرف حجّت کا ذکر ہے۔ حجّت امام کے بعد کے درجے ہیں، جس میں کُل ۲۸ حجّت ہوتے ہیں، وہ اس طرح کہ دنیا کے بارہ حصّے گنے گئے ہیں۔ ہر حصّے کو جزیرہ کہا جاتا ہے۔ ہر جزیرے میں دو حجّت ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک کو حجّتِ روز اور دوسرے کو حجّتِ شب کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ امامِ زمان کے حضور میں چار حجّت ہوتے ہیں۔ وہ بھی دو حجّتِ روز اور دو حجّتِ شب ہوتے ہیں۔ ان چاروں میں سے جو سب سے بڑا ہو اسے حجّتِ اعظم یا باب کہا جاتا ہے۔ جو کہ امامِ زمان کا وہ فرزند ہوتا ہے جو امامِ روزگار کے بعد امام بننے والا ہو۔ باب دروازے کو کہتے ہیں۔ رسولِ خدا حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ یعنی میں علمِ توحید کا شہر ہوں اور علیؑ اس شہر کا دروازہ ہیں۔ حضرت مولانا علیؑ حضرت محمّدؐ کا حجّتِ اعظم یعنی باب تھا۔ اس لئے کہ دورِ ناطق کا حجّتِ اعظم امام خود ہی ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ ۲۸ حجّت کو عالمِ دین کے اٹھائیس منازل اور بارہ حجّت کو بارہ بُروج کہا جاتا ہے۔ بارہ حجّت اس طرح ہوتے ہیں، کہ دنیا کے صرف بارہ جزیرے یعنی حصّے ہیں۔ اگر بارہ جزیروں میں سے ایک ایک حجّت گِنا جائے تو کُل بارہ ہوئے۔ اور یہ بارہ حجّت عالمِ دین کے بارہ بُروج ہیں۔

حجّت کی روحانی اور علمی قابلیت کا اندازہ معلوم کرنے کیلئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سلمان الفارسی شمس تبریز حکیم ناصرِ خسرو، پیر صدرُالدّین، پیر حسن کبیرالدّین وغیرہ جیسے بہت سے باکرامت پیر اور بزرگ اپنے اپنے زمانے کے حجّت تھے۔ اور باقی حجّت بھی علم و کرامت اور بزرگی میں بالکل اسی طرح تھے، جس طرح یہ تھے۔ لیکن یہ

دوسری بات ہے کہ اگر وقت کی ضرورت کے مطابق بعض حجتوں نے اپنے علم و کرامت کو ظاہر کیا ہو، اور بعضوں نے مصلحتاً پوشیدہ رکھا ہو۔ کسی بزرگ کی اس بیت سے بھی حجّتوں کی روحانیت ملاحظہ ہو:

از دلِ حجّت بحضرت رَہ بُود ⁛ او بتائیدِ دلش آگہ بُود

یعنی حجّت کے دل سے امامِ زمان تلک روحانی صاف راستہ ہوتا ہے۔ اور امامِ زمان اپنے حجّت کے دل میں روحانی بات پہنچانے سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا۔

حجّت روحانی عروج کی وہ حدّ ہے جہاں حقائق الاشیاء کے جملہ علوم و معارف موجود ہیں۔ یہ وہ بلند مقام ہے جس پر سے چڑھنے والے کو کون و مکان کی حقیقت چشمِ باطن سے بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ معرفتِ نفسِ انسانی جو دراصل وہی پروردگار کی معرفت ہے، بدرجۂ کمال حجّت کی حدّ میں حاصل ہو سکتی ہے۔ کتبِ سماوی اور مختلف شرائع کی تاویل بھی پوری امکانیت کے ساتھ حجّت کو میسّر ہو سکتی ہے۔ حجّت اور فتح یعنی میکائیل ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔

فرعِ ششم داعی

داعی بلانے والے یعنی سچے دین کیطرف دعوت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳:۴۶)۔ یعنی: "اے محمدؐ ہم نے تجھے اللہ کیطرف اسکے اذن سے بلانے والے اور اجالے چراغ کی حیثیت میں بھیجا ہے۔"

اس آیت میں آنحضرتؐ کو داعی اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ خود بھی دعوت کرتے تھے اور اپنی نگرانی میں بھی دعوت کراتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کی طرف سے دعوت کرنے والے تو ضرور موجود تھے۔ کیونکہ رسول اللہؐ کا خاص کام نبوت ہے۔ اور دعوت نبوت کی نگرانی میں ہوتی ہے۔

پس معلوم ہو کہ اسماعیلی مذہب کے اعتقاد کے مطابق حجّت کے بعد داعی ہے۔ان کی تعداد ہر جزیرے میں تیس اور بارہ جزیروں میں کُل تین سو ساٹھ ہے۔ جو متوسط سال کے دنوں کے برابر ہوتی ہے۔

علم وفضل کے لحاظ سے داعیوں کے بھی مراتب ہوتے ہیں۔اور عام طور پر داعی دو قسم کے ہوتے ہیں، داعیٔ مطلق اور داعیٔ محدود یا مکفوف۔ ان دونوں داعیوں میں جو فرق ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ داعیٔ مطلق روحانی لحاظ سے اپنے سے اوپر کے درجوں میں مل جاتا ہے۔لیکن ظاہری کام ایک داعی کیطرح کرتا ہے۔ داعیٔ محدود یا داعیٔ مکفوف ظاہراً و باطناً صرف حدِّ دعوت کے لائق ہوتا ہے۔ان تمام داعیوں کو اپنے اپنے جزیروں کے حجّتوں سے علم ومعرفت روحانی اور جسمانی دونوں طریقوں سے ہر وقت ملتی رہتی ہے۔ داعی اور خیال ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔قولہٗ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۹:۳۶)۔ترجمہ: ”مہینوں کی گنتی اللہ کے پاس بارہ ہے۔اللہ تعالیٰ کی کتاب میں، جس دن پیدا کئے آسمان و زمین۔ان میں چار امن کے ہیں۔یہی ہے دینِ قیم۔“

حدودِ دین مستجیب سے شروع ہوتے ہیں۔مستجیب دینی دعوت کو قبول کرنے والے مرید کا نام ہے۔یعنی یہ اس مرید کی حد ہے جو محض فیض لینے والا ہو، خود سیکھتا ہو۔جس طرح قرآن مجید میں ذکر ہے: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۶:۳۶)”یعنی صرف وہی لوگ مانتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ بعث دے گا۔پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“ مستجیب میں دعوت کرنے کی قابلیّت پیدا ہونے پر اسے دعوت کرنے کیلئے اِذن ملتا ہے۔ اور وہ اس وقت ماذون کہلاتا ہے، دونوں قسم کی ماذونی کے فرائض کی انجام دہی

کے بعد وہ داعیٔ مکفوف پھر داعیٔ مطلق پھر حجتِ جزیرہ کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی زندگی میں مومن کی روحانی عروج کی آخری حد صرف درجۂ حجّتی ہے۔

دربیانِ مراتبِ حدودِ دین

۱	مستجیب	محرّم
۲	ماذونِ محدود	صفر
۳	ماذونِ مطلق	ربیع الاوّل
۴	داعیٔ محدود	ربیع الثّانی
۵	داعیٔ مطلق	جمادی الاوّل
۶	حجّت	جمادی الثّانی
۷	باب	رجب
۸	امام	شعبان
۹	اساس	رمضان
۱۰	ناطق	شوّال
۱۰۰	نفسِ کُل	ذیقعد
۱۰۰۰	عقلِ کُل	ذوالحجّہ

دربیانِ ایّامِ عالمِ دین

جس طرح دنیاوی ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں، اسی طرح دینی ہفتے کے بھی سات دن ہیں۔ کیونکہ عالمِ ظاہر اور عالمِ دین بالکل ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ مگر فرق اتنا ضرور ہے کہ عالمِ ظاہر عالمِ دین کے مقابلے میں مُردے کی طرح ہے اور عالمِ دین عالمِ ظاہر کے مقابلے میں زندہ کی طرح ہے۔ اس قول کی سچائی کی دلیل اس آیت سے ملے گی۔ قولہٗ تعالیٰ: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹:۶۴)۔ ترجمہ: "اور یقیناً آخرت کا گھر وہی ہے جو زندہ ہے۔ اگر وہ جانتے ہوں۔" اس آیت کے تخصیصِ بیان سے یہ ثابت ہوا کہ صرف آخرت ہی زندہ ہے، اور دنیا مُردہ ہے۔ اس لئے کہ اگر دنیا بھی آخرت کی طرح زندہ ہوتی تو یہ نہ کہتا کہ آخرت کا گھر زندہ ہے۔ کیونکہ پہلی چیز دوسری چیز سے مخصوص اس وقت کی جاتی ہے جبکہ دوسری چیز میں پہلی چیز کی وہ خاصیت موجود نہ ہو۔ اب بلاشبہ ثابت ہوا کہ آخرت زندہ اور دنیا مری ہوئی ہے۔ اب یہ جاننا ضروری ہے کہ آخرت کا گھر کس طرح زندہ ہے؟ اس حقیقت کو ہم اسی لفظ "حَيَوَانُ" کی معنوی گہرائیوں سے نکال سکتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ بھی یاد رکھئے کہ قرآنِ مجید اَحْسَنُ الْقَصَصْ ہونے کی وجہ سے مشترک المعنیٰ الفاظ سے پُر ہے۔ اور یہ اس کی لاانتہا خوبیوں میں سے ایک ہے۔ یعنی لفظ مشترک المعنیٰ وہ ہے جسکے کئی معنی ہوں۔ قرآنِ شریف چونکہ احکم الحاکمین

کا کلام ہے اس لئے یہ جملہ علوم و اصطلاحات کے مطابق حکمت خیز معنی دینے والی کتاب ہے۔ اب پھر لفظ "حَیَوَانُ" کی طرف توجّہ ہو۔ اس لفظ کے تین معنیٰ ہیں : زندہ[1]، حیوانِ صامت[2]، حیوانِ ناطق[3]، اب حیوان کے ان تینوں معنوں کا استعمال اس طرح ہوگا۔ آخرت کا گھر زندہ ہے۔ آخرت کے گھر میں جان ہوتی ہے۔ یعنی وہ گھر چلنے پھرنے، حس و حرکت کرنے والا ہوتا ہے۔ آخرت کا گھر ایک انسان ہے۔ اس لئے وہ گھر اپنے اندر قیام کرنے والوں سے بات چیت کرتا ہے۔ اور اس میں قیام کرنے والے بھی اپنے مکان سے بات چیت کرتے ہیں۔

اس مطلب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عالمِ دین ہی آخرت ہے۔ یعنی عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق، اساس، جدّ، فتح، خیال، امام، حجّت، داعی اور دیگر حدودِ دین عالمِ دین ہے اور دارُالآخرت ہے۔ اور یہی زندہ ہے، پھر واضح ہو کہ عالمِ دین کی تمام چیزیں زندہ ہیں۔ اسی طرح عالمِ دین کے ایّام ہیں، یعنی وہ زندہ ہیں۔ چنانچہ آدمؑ یک شنبہ، نوحؑ دوشنبہ، ابراہیمؑ سہ شنبہ، موسیٰؑ چہار شنبہ، عیسیٰؑ پنج شنبہ، محمّدؐ آدینہ اور قائم علینا منہ السّلام یومِ شنبہ ہیں۔ ظاہری طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں عالم کو پیدا کر دیا اور ساتویں دن عرش پر قرار کیا۔ اور یہ بھی قرآنِ شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہمارے حساب کے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ جس طرح قرآنِ شریف میں ذکر ہے : وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲ : ۴۷)۔ ترجمہ : "اور تحقیق تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔" اس حساب سے وہ چھ دن چھ ہزار برس ہوئے۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے عالم کو پیدا کیا۔ دوسری طرف یہ بھی قرآنِ شریف میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کو بطورِ ابداع پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ : بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲ : ۱۱۷)۔ یعنی "آسمانوں اور زمین کو بغیر مادّے کے اور بغیر کسی دیر کے پیدا کرنے والا"۔ یعنی خلق

اور اِبداع میں یہ فرق ہوتا ہے کہ خلق میں ایک چیز سے دوسری چیز پیدا کی جاتی ہے اور اس کیلئے کم یا زیادہ وقت لگتا ہے اور اِبداع میں بغیر کسی چیز کے اور بغیر کسی دیر کے ایک چیز بنائی جاتی ہے۔

اب اگر کوئی اسکی حقیقت تلاش کرے تو معلوم ہوگا کہ اُس تعالیٰ نے چھ دن میں عالمِ دین کو پیدا کیا ہے اور اس جہان کو "کُن" کے امر سے پیدا کیا ہے۔ جسے اِبداع کہتے ہیں۔ اور وہی اللہ تعالیٰ کے چھ دن جن میں اس نے عالمِ دین بنایا ہے، [جن کے] انسانی حساب سے چھ ہزار برس ہوتے ہیں۔ اور وہ چھ ناطقوں کے چھ ہزار برس کا دَور ہے۔ جن میں عالمِ دین ہر طرح سے مکمل ہو چکا ہے۔ ساتواں دن دورِ قائم ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے عرش پر قرار کیا۔ یعنی قائم میں ظہور ہوا۔

خلاصۂ مطلب

	صاحبانِ ہفت ادوارِ بزرگ	ایّام خدائی	سال بحسابِ بندگان	جہت	مقابلہ جہتی
۱	آدمؑ	یوم الاحد	۱۰۰۰	فوق	
۲	نوحؑ	یوم الاثنین	۱۰۰۰	یسار	
۳	ابراہیمؑ	یوم الثّلاثہ	۱۰۰۰	خلف	
۴	موسیٰؑ	یوم الاربعاء	۱۰۰۰	تحت	
۵	عیسیٰؑ	یوم الخمیس	۱۰۰۰	یمین	
۶	محمّدؐ	یوم الجمعہ	۱۰۰۰	امام	
۷	قائمؑ	یوم السّبت	۱۰۰۰	لاجہت	

قولہٗ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۷:۵۴)۔ ترجمہ: "تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں

اور زمین کو چھ دن میں بنایا، پھر تخت پر بیٹھا۔"

دائرۂ ہفتۂ دین

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

امامِ زمان کی پہچان اور اس کی اطاعت کے بیان میں

ترجمہ از کلام حضرت حکیم سیّد شاہ ناصر خسرو قدس اللہ سرّہٗ

اس دنیا کی تمام مخلوقات و موجودات میں سے انسان اشرف و اعلیٰ اس لئے ہوا کہ اسے دُوسرے جانوروں کو مستثنیٰ رکھتے ہوئے عقل جیسی شریف چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوئی، یہ محض وہ عقل تھی جو نشو و نما کی ابتدائی منزل سے ہمیشہ پرورشِ علمی کی محتاج ہوتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ حکمت اور جود والا خدا اس پیاری چیز یعنی عقل کو بغیر پرورش کے چھوڑ دیتا، بلکہ از روئے قانونِ عقل یہ لازم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے ایک خاص الخاص شخص کو لوگوں کی طرف بھیجے تاکہ وہ انکی عقول کی پرورش اپنے علم سے کرے، کیونکہ کسی حاجت مند کو پیدا کرنا اور اسکی حاجت روائی کرنے والے کو پیدا نہ کرنا محض بخالت ہوتی ہے مگر اللہ تبارک و تعالیٰ بخالت سے دُور ہے۔ اگر ہم اس کائناتی کتاب سے اس حقیقت کی مزید تلاش کریں تو ہمیں ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حیوانوں کو گھاس پات کھانے والی رُوح دی گئی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ آسمانوں، ستاروں اور عناصرِ اربعہ کو بھی ان کیلئے گھاس اگانے پر مقرر کئے گئے تھے، کیونکہ اس قسم کی نباتاتی اشیاء میں جانوروں کی جسمانی پرورش ہے۔ پھر اس خدائی قانون سے یہ ثابت ہوا کہ لوگوں میں ایک ایسا پالنہار ضرور

ہوگا جو کہ ہر وقت انسانوں کی عقول کو اس علم سے پالتا رہے جس علم کے لئے انہیں ضرورت ہوتی رہتی ہے۔

یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ جسطرح یہ ابتدائی عقل تمام حیوانات سے صرف انسان کو اکتسابی نہیں بلکہ یہ تمام حیوانات سے مستثنیٰ اسے ایک عطائے الٰہی ہے، تو اسی طرح خدائی عادت سے یہ لازم ہوتا ہے کہ جس قسم کے علم کیلئے انسانوں کی ابتدائی عقول محتاج ہوں وہ علم صرف ایک شخص کے پاس عطائی (تلاش کے بغیر) ہو اور اکتسابی یعنی کمایا ہوا نہ ہو کیونکہ اگر وہ علم اکتسابی ہوتا تو ہر شخص اپنی کوششوں سے اس علم کو حاصل کرسکتا، پھر اِس صورت میں اللہ کی طرف سے کسی پیغمبر یا ہادی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

جب تمام حیوانوں سے صرف انسان ہی اس ابتدائی عقل کی عطا کے لئے مخصوص ہوا۔ باوجودیکہ وہ حیوان کی ایک نوع (قسم) تھا، پھر یہ لازمی ہے کہ تمام انسانوں میں سے بھی صرف ایک ہی شخص کے بغیر اور کسی کو عقل پروری عطا نہیں ہوئی ہو، تاکہ کائنات سے مثال جوئی کے طریقے پر یہ ترتیب دلیلاً ٹھیک ہوسکے۔ کیونکہ نوع یعنی چھوٹی قسم جنس یعنی بڑی قسم کے نیچے ہوتی ہے۔ اور شخص یعنی اس سے بھی چھوٹی قسم کے نوع کے نیچے ہوتی ہے۔ مثلاً حیوان اجناس میں سے ایک جنس ہے۔ حیوانِ ناطق اور حیوانِ صامت اس کی دو نوع ہیں۔ تمام انسان اپنی نوع یعنی حیوانِ ناطق کے افراد یا کہ اشخاص ہیں، اسی طرح تمام جانور اپنی نوع یعنی حیوانِ صامت کے افراد یعنی اشخاص ہیں۔

جب حیوان کی جنس میں سے اسکی ایک نوع یعنی انسان فائدہ حاصل کرنے والی عطا یعنی ابتدائی عقل کیلئے مخصوص ہوا، تو یہ بھی لازم ہے کہ انسان کی نوع میں سے اس کے ایک شخص عطائی عقول پروری کیلئے مخصوص ہو، تاکہ یہ ترتیب از روئے

دلیل درست ہوسکے اور جو شخص عطائی عقول پروری کے لئے مخصوص مِنْ عِندِ اللہ ہوا ہے، پیغمبر ہے، اور جب تمام حیوانات میں سے انسان کی نوع عقل کیلئے مخصوص ہونے میں کوئی تعجّب نہیں تو پھر ایک شخص پیغمبری کے مرتبے کیلئے مخصوص ہونے میں کیا تعجّب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ (۷:۶۳) ترجمہ: "کیا تمہیں یہ تعجّب ہوا کہ نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہیں مل جائے ایک مرد پر جو وہ تم میں سے ہوتا کہ وہ تمہیں ڈرائے۔" وہی ایک شخص اپنے دَور کا پیغمبر ہوتا ہے اور اس کا وصی یہی کام اپنے عصر میں کرتا ہے اور ہر زمانے میں امامِ زمان اسی طرح مخصوص ہے، جب تک دنیا قائم ہو، تو انسان کی نوع اسی ایک شخص سے جو اس مرتبے کیلئے مخصوص ہے خالی نہیں ہوگی، جس طرح حیوان کی جنس انسان کی نوع سے خالی نہیں ہے اور نہ ہوگی۔

خلقت اور کُل عالم سے صانعِ حکیم کی جو غرض ہو وہ صرف وہی شخص جانتا ہے۔ پیغمبر اور اسکے وصی کی روحانی صلاحیت کا اندازہ اسی طرح پر نہیں کہ جس طرح ایک شخص دوسرے شخص سے زیادہ دانا ہو، یا ایک گائے دوسری گائیوں کی نسبت زیادہ موٹی ہو، کیونکہ وہ صرف اس فرق کے بل بوتے پر ایک مرد کی طرح دوسری گائیوں کو درندوں سے نہیں بچا سکتی ہے، اور نہ وہ انہیں مقررہ وقت پر چَرا کر واپس لاسکتی ہے۔ پھر یہ ثابت ہوا کہ ہمیشہ دنیا اُسی ایک شخص سے خالی نہیں رہتی جس کے بغیر انسان کو کوئی چارہ نہیں ہوسکتا، اور وہی اکیلا شخص خلق کی صلاح کو بچا سکتا ہے، جس طرح انسان کی نوع مویشیوں کی صلاح بچا سکتی ہے۔ اس قول کی سچائی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اس حدیث سے ملے گی۔ اُمِرْتُ لِصَلَاحِ دُنْيَاكُمْ وَنَجَاتِ آخِرَتِكُمْ۔ "کہ مجھے تمہاری دنیوی بہتری اور اخروی آزادی کیلئے فرمایا گیا ہے۔" اگر یہی ایک شخص دنیا سے چلا جائے تو لوگوں کے درمیان سے صلاح بھی چلی جائے

گی۔ فی المثل اگر تمام حیوانات میں سے انسان کی نوع وہمی طور پر اٹھائی جائے تو تمام جانور بھی نہ رہیں گے۔ اور وہ تمام جانور جن کی صلاح انسان سے وابستہ ہے درندوں کی زَد سے مرکر ختم ہو جائیں گے۔

اِسی طرح دُنیا میں ہمیشہ امامِ زمان کی موجودگی اور اسکی شناخت و اطاعت کی اہمیت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اس حدیث سے بغور ملاحظہ ہو: مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً وَالْجَاھِلُ فِی النَّار۔

ترجمہ: "جو شخص مَر جائے اور اُس نے اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانا ہو تو وہ نادانی کی موت مرتا ہے۔ اور نادان آتشِ دوزخ میں ہے۔"

اس حدیثِ شریف کی گہری حقیقت پر تبصرہ کرنے کیلئے حدیث کے دوسرے معنوی پہلو کو بھی بذریعۂ الفاظِ اضداد دکھائی گئی ہے۔ تامّل سے ملاحظہ ہو:

عکسِ مُستوِی

قضیہ

من	من	جو شخص	جو شخص
مات	مات	مرے	مرے
ولم یعرف	وعرف	اور نہ پہچانے	اور پہچانے
امام	امام	امام	امام
زمانہ	زمانہ	اپنے زمانے کا	اپنے زمانے کا
مات	حی	مرا	زندہ ہوا
میتۃ	حیا	ایک مردہ	ایک زندہ
جاھلیۃ	عاقلیا	نادانی کا	دانائی کا
والجاھل	والعاقل	اور نادان	اور دانا
فی النار	فی الجنۃ	آگ میں ہے	بہشت میں ہے

وضاحت

(۱) تمام انسانوں میں سے۔ (۲) موت جسمانی امام شناسی و ناشناسی کی حدِّ زمانی ہے۔ (۳) دنیاوی زندگی کا مقصد امامِ زمان کی معرفت ہے۔ (۴) وہ امام جس کی پہچان خدا کی پہچان ہو۔ (۵) صرف اپنے زمانے کا امام جو حاضر ہو۔ (۶) موت وحیات دو قسم کی ہے، روحانی اور جسمانی۔ (۷) رُوح سے زندہ ہو چکا تھا مگر جسم خارج تھا۔ (۸) روحانی زندگی کے لئے عقل صرف امام سے حاصل ہوتی ہے۔ (۹) عاقل کا سبب عقل، عقل کا سبب معرفتِ امامِ زمان۔ (۱۰) بہشت ملنے کا سبب عاقل ہونا۔

مذکورہ حدیث کا فلسفہ

اگر عقل سے پوچھا جائے کہ انسان کو کس لئے پیدا کیا گیا ہے؟ بتائے گی کہ خدا کی عبادت کیلئے! پھر عبادت کے لغوی معنی پوچھنے پر بتائے گی کہ لفظ عبادت عبد (غلام، نوکر) سے مشتق ہے، اس لئے عبادت کے معنی غلامی اور نوکری ہے، اگر اس لفظ کو فارسی میں لیا جائے تو پھر بھی یہی مطلب نکلتا ہے، مثلاً عبد بمعنی بندہ یعنی غلام، اور عبادت کے معنی بندگی یعنی غلامی یا نوکری ہے۔ لفظ عبادت کے اصلی معنیٰ ظاہر کرنے کیلئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ لفظ قرآنِ شریف میں تسبیح و تقدیس، تحمید، تمجید، نماز، سجود، رکوع، دعا، ثناء، اور ذکر کے معنوں سے بالکل جُدا ہے۔

لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اگر ہم انسانوں نے اپنی عام اصطلاح میں باری سبحانہٗ کی صفاتِ جلالی و جمالی بیان کرنے کا نام عبادت رکھا ہو مگر احکم الحاکمین انسان کی غلط اصطلاحوں کی تقلید کرنے سے بہت برتر ہے، بلکہ خدائے پاک نے اپنی حکمتِ بالغہ سے ضروری الفاظ کی حفاظت انکی اصل میں کی ہے، یعنی ہر لفظ کا اصلی مصدر بطریقِ احسن ظاہر کیا ہے، تاکہ کوئی گروہ اپنی اصطلاح سے قرآنِ مجید کے معنی نہ بدل سکے، اور تلاشِ حکمت کیلئے خود قرآنِ مجید ہی اپنے الفاظ کی حقیقی لغات اور خود

تفسیر و تفصیل بن سکے، چنانچہ لفظِ "عبادت" کی اصل یعنی مصدر عبد ہے اور اس کی ایک حفاظت گاہ اس آیت میں ہے کہ: وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (۲:۲۲۱)۔ "یعنی ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے اگرچہ تمہیں خوش آوے۔" پھر اس دلیل کی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ عبادت کو اپنے لئے منسوب کریں تو اس عبادت سے ایک ایسا عمل مقصود ہے جو کہ اس کے حکم کے مطابق ہو۔ اس قسم کے عمل قبول کرنے کے بعد عمل کے معنی علم بھی ہوگا، کیونکہ پہلے عمل پھر علم ہے، جس طرح پہلے جسم بنتا ہے، پھر روح۔ عمل جسم کی مانند ہے اور علم روح کی مانند ہے، اس لئے فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱:۵۶)۔ ترجمہ: "اور میں نے جن اور انس کو پیدا نہیں کیا مگر اپنی عبادت کیلئے"۔ بھلا یہ سوچئے کہ! عبادت جس کا مطلب ہے عمل کرنا، اللہ تعالیٰ کا، جو غنیٔ مطلق ہے، کیا واسطہ ہے؟ بلکہ اس کی حقیقت اسی طرح ہے کہ عبادت یعنی عمل کرنا نفسِ کُل کیلئے ہے، کیونکہ نفسِ کُل نے جو کہ خدائے تعالیٰ کا ایک عظیم فرشتہ ہے، دنیا اور مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اسلئے کہ عمل اس کیلئے ضرورت ہے، اور نفسِ کُل کا مظہر امامِ زمان ہے۔ لہٰذا امامِ زمان کی غلامی یعنی بندگی ہی نفسِ کُل کی اصلی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں انسان کی دنیاوی زندگی کا سبب بتایا گیا ہے، جو کہ وہ سبب صرف عبادت ہے۔ اور مذکورہ حدیث میں انسان کی اخروی زندگی کا سبب بیان کیا گیا ہے، جو کہ صرف معرفت ہے، یعنی خدا نے جس چیز کے آغاز کا ذکر کیا تھا رسول اللہ نے اسی چیز کے انجام کا ذکر کیا ہے، ورنہ خدا اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قول میں اختلاف ہرگز نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ آیت اور حدیث میں ایک ہی چیز کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، نیز یہی کہنا حقیقت ہے کہ جس شخص کو عبادت کی وجہ سے جسمانی زندگی ملی ہو اسی شخص کو معرفت کی وجہ سے روحانی زندگی ملے گی۔

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر زمین امامِ زمان سے ایک گھنٹہ کیلئے خالی رہ جائے تو وہ اپنے اوپر بسانے والوں کے ساتھ نیست ہو جائے گی۔ حدیث: لَوْخَلَتِ الْاَرْضُ مِنْ اِمَامِ الْوَقْتِ سَاعَةً لَمَادَتْ بِاَهْلِهَا۔ پھر جب زمین ہمیشہ سے اپنے اوپر مخلوقات کو اٹھائے ہوئے فضا میں معلق ٹھہری ہوئی ہے اور ٹھہرے گی تو کوئی ایسا وقت لازم نہیں ہوتا جس میں امامِ زمان ظاہراً و باطناً لوگوں کو فیض پہنچانے کیلئے موجود نہ ہو۔ کیونکہ اس حدیث کے کھلے مفہوم کے مطابق زمین کا ٹھہراؤ اور ذی حیات کی زندگی کا دار و مدار امامِ زمان کی موجودیت پر ہے۔ یہ مسئلہ بہت گہری حقیقت رکھتا ہے کہ زمین اور اس کے اہالیان کی ہستی اور نیستی امامِ زمان سے کیوں وابستہ ہے؟ اصلیت ڈھونڈنے والوں کو یہ جاننا ضروری ہے کہ خدائے تعالیٰ بذاتِ خود فاعل نہیں بلکہ وہ بادشاہِ مطلق ہے، اسلئے اس کا فعل حدودِ علوی و سفلی کی نسبت سے ہے، لہٰذا رسولِ پاکؐ اور امامِ زمانؑ کا فعل ہی خدا کا فعل ہے، انکی اطاعت خدا کی اطاعت اور انکی محبت خدا کی محبت ہے، قولہٗ تعالیٰ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ . . . (۴ : ۸۰)۔ یعنی "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ پھر جس نے رسول کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اسی طرح سورۂ فتح کی دسویں آیت میں یہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ تھا اور رسولؐ کی بیعت خدا کی بیعت تھی۔ خلاصہ سُخن یہ ہے کہ رسولؐ کی گفتار اور کردار خدا کے حکم سے ہونے کی وجہ سے خدا کی طرف منسوب تھا، بحکم: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷)۔ یعنی "تو نے جس وقت کافروں کیطرف کنکر پھینکا، وہ پھینکنا تیرا نہیں تھا بلکہ اللہ نے پھینکا"۔ یعنی پہلے جملہ میں کہتا ہے کہ جس وقت تُو نے پھینکا، پھر کہتا ہے تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔ جب ظاہری فعل رسولؐ نے خدا کے حکم سے کیا تو خدا کا کرنا ہوا، یعنی کہ نسبت خدا کی ہوئی اور کرنے والے

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم تھے۔

اسی طرح مولانا مرتضیٰ علیؑ رسُول اللہؐ کے جانشین تھے، اوران کی اطاعت رسول اللہؐ کی اطاعت تھی، چونکہ وہ رسول اللہؐ کے وصی تھے، اور ہر زمانے میں امامِ زمان حاضر اسلئے ہے کہ اس کے ذریعے سے خدا اور رسولؐ کی اطاعت مومنوں سے قبول ہوسکے۔ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر زمانیکے لوگوں کوان کے زمانیکے امام کی زبان اوراس کی آواز سے اپنے پاس بلائے گا اورامامِ زمان کی شکل وصورت میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا، جنہوں نے دنیا میں دیدۂ حقیقت سے نہیں دیکھا ہو، وہ وہاں بھی نہیں دیکھ سکیں گے، قولہٗ تعالیٰ: یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِھِمْ (۱۷:۷۱)۔ترجمہ:"جس دن سارے لوگوں کو انکے امام سے بلائیں گے۔" "کُلَّ اُنَاسٍ" ناس کی جمع الجمع ہے اوراس سے مُراد اوّلین وآخرین یعنی کُل زمانوں کے انسان ہیں۔ جب ہر زمانہ والوں کواُن کے امام سے بلانا ہے توکوئی زمانہ ایسا نہیں جسمیں امام نہ ہو، کیونکہ اللہ نے لوگوں کو قیامت کیلئے بُلانے کا قانون ظاہر کیا کہ وہ صرف ان کے امام کے ذریعہ سے بُلائے گا، جب اللہ کا بلانا امام کے ذریعہ سے ہے تو کلام بھی امامِ زمان کی زبان سے ہوگا اور آواز بھی امام کی ہوگی، پھر بالضرورت شکل و صورت بھی نورانیت میں امام کی ہوگی، کیونکہ بعضوں کا خیال ہے کہ اللہ پاک بذاتِ خود مشخّص ومشکّل نہیں ہے اور وہ بذاتِ یکتائی خود فعل وصفت وصورت ومادہ اور سب چیزوں سے منزّہ وپاک ہے، لیکن قرآنِ شریفؑ کی بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے دیدار پر یقین نہ رکھنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ بہرحال امامِ زمان کا نورانی دیدار بتدریج لوگوں کو بھی دکھایا جائے گا۔

واضح ہو کہ اس آیت میں حرف "باء" لفظِ امام کے شروع میں آیا ہے، اسے عربی قواعد میں "بائے استعانت" کہتے ہیں، اس کے ہم معنی حرف "وَبِالنَّجْمِ ھُمْ

يَهْتَدُوْنَ" (۱۶:۱۶) کا "باء" ہے، یعنی وہ ستاروں سے راہ پاتے ہیں، یا کہ ستاروں کے ذریعے سے راہ پاتے ہیں۔ اسی طرح "وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ" (۱۵:۷۹) اور وہ دونوں یعنی عقلِ کُل و نفسِ کُل ظاہر امام کے ذریعے سے ہیں، کیونکہ کسی عام انسان کی عقل و جان کو عقلِ جزوی و نفسِ جزوی کہتے ہیں اور زمانے کا انسانِ کامل پیغمبر یا امام کی عقل و جان کو عقلِ کُلّی و نفسِ کُلّی کہتے ہیں۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ جسطرح امام کی یا پیغمبر کی شخصیت تمام شخصیتوں سے اشرف و اقدس ہوتی ہے، اسی طرح ان کی روح اپنی کُل قوتوں سے آراستہ ہوتی ہے اور اسی طرح ان کی کُلّی عقل جو ازل سے موجود تھی انہیں مستفیض کرتی ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے میرا نُور پیدا کیا، یعنی عقلِ کُل۔ پھر آنحضرتؐ اپنے اس نُور سے رسالت ملنے کے بعد سے مستفیض ہونے لگے، اگرچہ اس سے پہلے بھی تمام لوگوں میں سے اشرف تھے، پھر کس قدر ضروری ہے پیغمبر اور امامِ زمان کی نورانی شناخت ان لوگوں کے لئے جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

تفسیر وجہ اللہ

حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا بیشک اس نے اللہ کو دیکھا۔ اس حدیث میں مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَأَیٰ اللّٰہَ۔ اب ذرا غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ اس حدیث کی تہہ میں کس قسم کی حکمت پوشیدہ ہے، اور اس حکمت تک ہماری عقل کی رسائی کس طرح ہوسکتی ہے۔ اگر سچ پوچھنا ہے تو انسان از خود کچھ بھی نہیں، جب تک خداوندِ تاویل مدد نہ فرمائے، اسلئے خازنِ حقائق سے توفیق مانگتے ہیں۔ اس پُرحکمت حدیث کے غیر معمولی وسیع معنی سے بمثالِ قطرۂ از دریائے فراوان یوں بیان کی جاتی ہے کہ دیکھنا یعنی دیدار تین قسم کا ہوتا ہے مثال کے طور پر دائیں آنکھ سے دیکھنا، بائیں آنکھ سے دیکھنا اور دونوں آنکھوں سے دیکھنا۔ اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ دیکھنے کے ان تینوں طریقوں میں سے کونسا طریقہ بہترین ہے؟ تو بلا تامّل آپ بتا سکیں گے کہ دونوں آنکھوں سے کسی چیز کو دیکھنا بہترین طریقہ ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے، اس کا ممثول یہ ہے کہ دائیں آنکھ کہتے ہیں دیدارِ جسمانی کو، بائیں آنکھ کہتے ہیں دیدارِ روحانی کو، اور دونوں آنکھوں سے مراد جسمانی و روحانی ہے، جس نے رسُول اللہؐ کو صرف جسمانیت میں دیکھا اُس نے حقیقت میں اپنی بائیں آنکھ بند کرلی اور جس نے رسول اللہؐ کو صرف روحانیت میں دیکھا تو اس نے اپنی دائیں آنکھ بند کرلی، جس نے جسمانیت اور روحانیت دونوں حالتوں میں

اپنے رسول پاکؐ کی شناخت حاصل کرلی اس کی دونوں آنکھیں کُھلی رہیں۔

اب یہ بتادوں گا کہ ہر حالت میں دیدار کے دو بڑے مقصد ہیں، یعنی جمال اور شناخت۔ نورانیت اور جسمانیت میں جمال و شناخت کے نتیجوں سے کشش اور کوشش ہوسکتی ہے، اور یہ سب کچھ چہرے سے ہوسکتا ہے، ازانکہ جملہ صفاتِ بشریّت کا متحمّل چہرہ اور سر کے سوا اور کوئی عضو نہیں ہے، پھر رسولِ پاکؐ نے اس حدیث کی حکمت میں داناؤں کو یہ ضرور کہا ہوگا کہ مجھے ظاہر و باطن میں دیکھو، میں خدا کا چہرہ ہوں، اسلئے میرا دیدار خدا کا دیدار ہے، میرا جمال بھی جمالِ الٰہی ہے، میری شناخت خدائے برتر کی شناخت ہے، جس نے مجھے دیکھا اور نہیں پہچانا وہ بہت خسارے میں رہا، کیونکہ نبیٔ رحمت کا یہ کہنا کہ "جس نے مجھے دیکھا بے شک اس نے اللہ کو دیکھا۔" بہت معنی رکھنے کے علاوہ دیدار کی ترغیب دیتا ہے۔ نیز اس حدیث کی عمقیّت سے زمانے کے پیغمبر اور امام کی شناخت اور ان کی فرمانبرداری و محبت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، اور آخر میں یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ رسول اللہؐ اپنے زمانے میں خدا کا چہرہ تھے۔ جب وہ خدا کا چہرہ تھے تو ضرور وہ خدا کی زبان، آنکھیں، کان وغیرہ سب کچھ تھے۔ مومنوں کیلئے اس میں کوئی شک نہیں کہ نبیٔ رحمت اپنے زمانے میں خدا کا چہرہ اور خدا کا دیدار تھے، اسی طرح مولانا علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا کہ "اَنَا وَجْہُ اللّٰہِ" (میں اللہ کا چہرہ ہوں)۔ ہمیں یقین ہے کہ وہی اللہ کا ایک چہرہ ہے اور ہمیشہ دنیا میں موجود ہے۔ جس شخص سے خُدا کی معرفت حاصل ہو جائے وہی خدا کا چہرہ ہے۔ اور ایسا شخص جس پر خدا کی معرفت ہوسکتی ہو، اپنے اپنے زمانے میں پیغمبر اور امام ہیں، چونکہ خدا کا چہرہ لافانی ہے، اس لئے امامِ زمان ہمیشہ دنیا میں زندہ اور حاضر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلامِ مجید میں فرماتا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸:۸۸)۔ ترجمہ: "ہر چیز فنا ہونے والی ہے اس کے چہرے کے سوا، حکم اس کا

ہے اور تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

ہر چیز کی بے بقائی کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا اپنے چہرے کو اس بے بقائی سے مستثنیٰ کرنے سے معلوم ہوا کہ اسکا چہرہ ایک لحاظ سے ان چیزوں کیساتھ اور اسی عالم میں ہے جہاں دوسری بے بقاء چیزیں ہیں، کیونکہ کُلُّ شَیۡءٍ کے بعد حرفِ اِلَّا کا آنا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ وَجۡهَهٗ بھی شے کی جنس سے ہے اور عالم اشیاء میں ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ چہرہ کے متعلق بعضوں کو فنا کا شُبہ پڑتا ہے، اسلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کو غیر فانی بتایا۔ چیزوں کا یہ ہلاک ہونا صرف جسمانی موت تھی، پھر حکم اور فیصلہ کے اور پھر اسکی طرف واپس جانے کے نتیجوں سے واضح ہوا کہ سب انسان مر جاتے ہیں اور ان کے فیصلہ ہونے پر معاد کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن خدا کا چہرہ جو امام ہے ہمیشہ دنیا میں زندہ اور غیر فانی ہے۔ اگرچہ ظاہراً یہ بھی ان جملہ انسانوں کی جنس میں سے ہے جو وہ بعد از انقضائے وقتِ معین فنا ہونے والے ہیں، لیکن امامِ زمان خدا کا چہرہ اور اسکا نُور ہونے کی خصوصیت سے دوسرے ہم جنسوں سے جداگانہ اپنے جسمانی لباس بدلتے ہوئے دنیا میں ہمیشہ موجود اور حاضر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ احکم الحاکمین کی اس باحکمت آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چہرۂ خدا کی نسبت ایک وجہ سے ان تمام فنا پذیر اشیاء کیساتھ ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے بھی پہلے کُلُّ شَیۡءٍ میں ذکر کیا۔ اور دوسری وجہ سے چہرۂ خدا کی ان سے کوئی نسبت نہیں، اس لئے پھر اللہ پاک نے اسے حرفِ استثنٰے سے علیحدہ کر دیا، لیکن پہلی نسبتِ عامہ اور دوسری نسبتِ خاصہ ہے، پھر دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی، جسمیں آیتِ مذکورہ کی خصوصیات موجود ہوں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جملہ صفات کے ساتھ خدا کا چہرہ کہلانے کا حقدار ہو سکے۔ دوسری خصوصیت، جسمانی نسبت سے جسمانیوں کے نزدیک رہ سکے اور ان کو اپنے نزدیک کر سکے۔ تیسری خصوصیت، جسمانی نزدیکی

کے نتیجوں پر ان کو نورانیت اور بقا کے نزدیک کر سکے۔ قولہٗ تعالیٰ: یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴:۲)۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۵۱:۷)۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵:۱۵-۱۶)۔ ترجمہ: تمہیں آیا ہے اللہ کی طرف سے نور اور بولنے والی کتاب جس سے اللہ راہ دکھاتا ہے جو کوئی پیروی کرے اسکے رضوان کی۔ تائید کے راستوں پر اور انکو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ پر۔

شکلِ وحدت اصول بفعل مستدیر خود

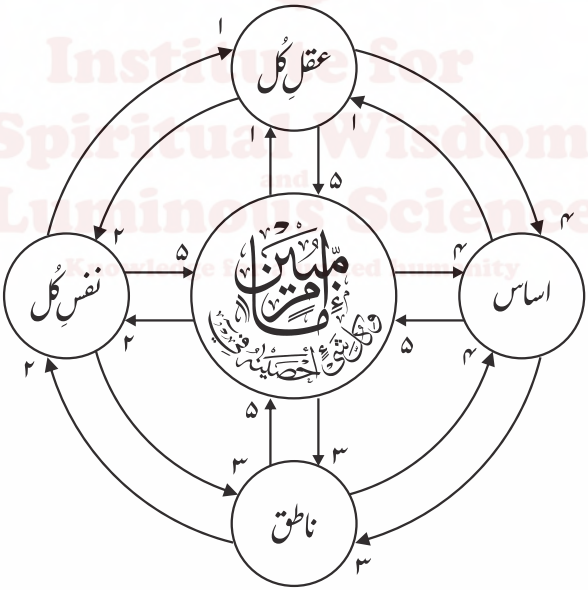

(۱) رجوعِ عقلانیّت (۲) رجوعِ روحانیّت

(۳) رجوعِ ناطقیّت (۴) رجوعِ جسمانیّت

(۵) رجوعِ دوامیّت

امامِ زمان نُورِ خداوندی ہے

اس مقام پر سب سے پہلے نُور کی حقیقت اور اس کے اقسام کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی حقیقی حالت سے واقف ہونے میں بہت سے فائدے ہیں۔

نور یعنی روشنی اس چیز کا نام ہے جس سے موجودہ چیز کی حالت کا علم براہِ نظر معلوم ہو سکے۔ اسکے برعکس ظلمت یعنی اندھیرا وہ شے ہے جس سے موجودہ چیز کی حالت کا علم براہِ نظر حاصل نہ ہو سکے۔ دوسرے الفاظ میں نور وہ ہے جس سے موجودہ اشیاء کی ظاہری حالت کا علم نظر سے دماغ کو حاصل ہو اور ظلمت وہ ہے جس سے موجودہ اشیاء کی ظاہری حالت کا علم براہِ نظر دماغ کو حاصل نہ ہو سکے۔ اور یہ صرف نورِ طبیعی یعنی ظاہری روشنی کا ذکر ہے جسکا منبع صرف سُورج ہے اور چاند تارے وغیرہ روشن چیزیں بذاتِ خود روشن نہیں بلکہ سُورج سے ان کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی روشنی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ظاہری چیزوں کو دکھا سکتی ہے۔ یعنی مکدّر اور غیر شفاف چیزوں کی بیرونی سطح مثلاً زمین، پتھر، نباتات، حیوانات اور غیر شفاف چیز ملا ہوَا پانی وغیرہ کے صرف بیرونی حصّہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم کی چیزوں کی سطح سے اندر کی طرف گزر کر سارے جسم میں پھیل نہیں سکتی۔ پھر اس صورت میں روشنی قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان سے سایہ نمودار ہوتا ہے۔ لیکن اجرامِ فلکی، کرّۂ اثیر، ہَوا، شفاف پانی،

آئینہ اور بلور وغیرہ سے یہ روشنی گزر جاتی ہے۔ اسی طرح ایسی چیزوں کے جسم کا کوئی ذرّہ روشنی سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر ان چیزوں کا سایہ نہیں پڑتا۔ اسلئے کہ روشنی ان سے رُکتی نہیں بلکہ ان سے گزر جاتی ہے۔ اس نتیجے سے معلوم ہوا کہ روشنی کے مقابلے میں دو قسم کی چیزیں ہیں، یعنی ایک چیز وہ ہے جو اپنی ذات کی طرف سے روشنی آنے نہیں دیتی اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے پاس والی چیز کو بھی روشنی لینے نہیں دیتی، یعنی حجاب ہوتی ہے۔ دوسری چیز وہ ہے جو اپنی ذات میں بھی روشنی بھر لیتی ہے اور پاس والی چیز کو بھی روشنی لینے سے نہیں روکتی۔ اسی ذکر کے سلسلے میں یہ بھی سمجھ لینا کہ اس روشنی کا منبع یعنی سُورج ایک خاص مقرّر قانون پر اپنا فعل کرتا ہے، چنانچہ یہ ہمیشہ اس عالم کے درمیانی دائرے پر واقع ہے اور اس کی بالکل گول شکل ہے۔ سُورج عالم کے درمیان اور بشکلِ گول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روشنی کسی خاص سمت کو نہیں بلکہ سارے عالم میں پھیل جائے جو کہ عالم بھی اسی طرح گول ہے۔

دوسری بات سُورج کے متعلق یہ ہے کہ یہ اپنی غیر موجودگی میں چاند اور ستاروں کی وساطت سے ہمیں روشنی پہنچاتا ہے مگر اتنی روشنی نہیں جتنی کہ وہ خود روشنی دیتا ہے۔ سُورج کی ایک اور عادت یہ بھی ہے کہ بالمقابل کی چیز بھلی ہو یا بُری ہو، اسے ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن وہ ہر حالت میں اس چیز کو روشنی اور گرمی بخشتا رہتا ہے۔ اس عالم کیلئے سُورج کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ہم اسی طرح کر سکتے ہیں کہ سُورج اس عالمی مشین کا وہ پُرزہ ہے جس پر ساری مشین کے چلنے اور کام کرنے کا دارومدار ہو۔

دوسری مثال میں سُورج کو اس عالم میں وہ حیثیت ہے جو حیثیت انسانی جسم میں دل کو ہوتی ہے، کیونکہ ہَوا اور پانی کی حرکت دن رات، بہار، تابستان، خزان، زمستان اور سال لگنے اور بڑھنے والی چیزوں کی نشوونمائی، پھلوں کا پکنا، ذِی حیات

کا جینا، چلنا پھرنا، کام کرنا اور تمام عالم کا نظامِ عمل کا دار و مدار سُورج پر ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ سُورج روشنی کا منبع ہے۔

اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہی نور ہے؟ جس کا ذکر قرآنِ شریف میں ہے یا اس طبیعی نور سے بالاتر کوئی اور نور ہے۔ اسکے بارے میں یہ ہے کہ اسلام کیساتھ دنیا کے بہت سے مذاہب میں بھی روحانی یعنی باطنی نور کا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ محکم دلیل قرآنِ شریف سے ملتی ہے: قولہٗ تعالیٰ: یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (۳۹:۶)۔ ترجمہ: "بناتا ہے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک بناوٹ کے بعد دوسری بناوٹ تین قسم کے اندھیروں میں۔" اس آیت سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ کسی چیز کی حالت بہتر کرنے کے مسلسل عمل کا نام خلق ہے (پیدا کرنا) اب تین قسم کے اندھیروں کے متعلق یہ ہے کہ جب ظلمت تین ہیں تو یقیناً نور بھی تین ہیں کیونکہ ہر چیز اپنی ضد پر پہچانی جاتی ہے۔ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا۔ یعنی "چیزیں اپنی اضداد پر پہچانی جاتی ہیں۔" چنانچہ سیاہ اور سفید صفت میں باہم ضد ہیں تو سیاہ سے سفید کی اور سفید سے سیاہ کی ہستی اور صفت کا قیاس لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ظلمت اور نور ایک دوسرے کی ضِد ہیں یعنی انکا فعل ایک دوسرے کے مخالف ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق و تدقیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ چیزوں کو دو یا تین یا اس سے اوپر کے اعداد میں اس وقت لائی جاتی ہیں جبکہ وہ چیزیں کسی بھی ایک وجہ سے ایک دوسرے سے جدا کی جاسکیں۔ مثلاً سُورج کی روشنی گنی نہیں جاتی، چنانچہ اگر کوئی شخص یوں کہے: "سُورج کی دو (۲) روشنی، سُورج کی تین یا چار روشنیاں وغیرہ"۔ تو اس کی بات فضول ہوگی، کیونکہ سورج کی روشنی تو صرف ایک ہے اور اسے سورج سے علیحدہ کرکے تہ بتہ رکھی نہیں جاسکتی ہے، پھر ظلمت اور تاریکی کی کیفیت بھی بالکل اس طرح ہے۔ یعنی تاریکی جسمِ ناشفاف کا سایہ ہے۔ اس لئے جس جسم کی سطح سے

اس کی ناشفافی کی وجہ سے اندر کی طرف روشنی کا گزر نہیں ہوا۔ تو وہ جسم اپنی سطح کے دائمی سائے میں رہتا ہے۔ یعنی اس کی سطح کے علاوہ تمام جسم کا خلا اور ملا یکسان طور پر اندھیرا رہتا ہے، جب دو متضاد چیزوں کو تہ بتہ یعنی ایک دوسرے کے اوپر بغیر کسی حجاب کے رکھنا ناممکن ہے، مثال کے طور پر پانی پر آگ، اس پر پانی، اس پر پھر آگ رکھنا، تو رحم سے لیکر جسم کی سطح تک ایک دوسرے کے اوپر تین ظلمت اور تین نور کے خول کا ہونا کس طرح ممکن ہے۔ بلکہ پوست، گوشت، جھلّی اور تری سبھی باہم پیوستہ جسم ہیں، اور ان میں کوئی روشنی نہیں، بلکہ یک لخت تاریکی ہے۔

طبعی روشنی کی بادلیل حقیقت ظاہر کرنے کے بعد اب مجھے یہ لازمی ہے کہ نور کی اور دو قسمیں بیان کروں، جو اس بیان کو عقل والے قبول کریں جسطرح اوپر بیان ہوچکا ہے کہ اس عالم کے درمیان میں سورج معلّق ہے اور اس کی شکل بالکل گول ہے، جس طرح اس کی شکل گول ہے، اسی طرح گولائی میں اس سے روشنی نکلتی ہے اور عالم کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے تمام عالم میں روشنی پھیلا سکتی ہے۔ چاند، تارے، بجلی، آگ، چراغ اور دوسرے پُرانے اور نئے روشنی کے ذرائع بھی دراصل سُورج ہی کے مظاہرات ہیں، اس لئے اس چشمۂ نور کے ہوتے ہوئے اس جسمانی عالم میں اور کسی قسم کے نور کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھا کہ اس قسم کی جسمانی روشنی کُل عالم یعنی جسمِ کُل کیلئے کافی تو ہے مگر یہ ظاہری چیزوں اور عالم کے کناروں تک محدود ہے۔ روح تو درکنار باوجود این ہمہ قوّت ہَوا میں اڑنے والے ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کے وجود پر ساری نہیں ہوسکتی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ جسمانی روشنی ہے، کیونکہ جسم اور اس کا فعل محدود ہے، جب جسم کیلئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور جسم ایک جداگانہ عالم ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ روح کا بھی جداگانہ اپنا ایک عالم ہے۔ اس لئے کہ یہ روا نہیں کہ جسم جو روح کا مرکب ہے یعنی گھوڑے کی طرح ہے،

ایک جداگانہ عالم میں رہتا ہو اور روح اپنا کوئی عالم نہ ہونے کی وجہ سے جسم کا محتاج رہے۔ یہ مثال ایسی ہے کہ حیوانوں کی ایک اپنی دنیا ہو اور انسانوں کی کوئی دنیا نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر انسان بھی حیوانوں سے کام لینے کی غرض سے اصطبل اور آغیل وغیرہ میں ہی جایا کریں، مگر یہ ان کا اصلی مکان نہیں ہوسکتا ہے۔

ثابت ہوا کہ ایک عالمِ روحانی بھی ضرور ہے۔ جب روحانی عالم ضرور ہے تو اس میں روحانی سورج بھی ضرور ہے، جسم اور روح سے بالاتر عقل ہے، جس طرح جسم اور روح کی نسبت عقل سب کچھ کرسکتی ہے اور عقل میں سب کچھ ہے۔ چنانچہ ایک مثال سے بے جان چیزوں کو جسم، حیوانوں کو روح اور انسانوں کو عقل مان لو تو پھر سوچے بغیر بتا سکتے ہو کہ تینوں میں سے غنی اور بادشاہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ جو ان میں سے عقل کے مرتبے پر ہو وہی غنی اور وہی بادشاہ دونوں پر ہے۔ پھر لازم ہوا کہ عقل زیادہ غنی ہے یعنی اس کا ایک جُداگانہ عالم ہے جس میں جسم اور روح کی نسبت بہت کچھ ہے۔ اس عقلانی عالم کی روشنی بھی اپنی قسم کی ہے۔ یہی حقیقت تھی جب انسان اپنی ماں کے پیٹ میں رہا، تو اسے ظلمتِ طبیعی، روحانی اور عقلانی سہنا پڑتا تھا۔ جاننے والوں کو اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودات تین قسم کی ہیں: یعنی جسم، روح اور عقل۔ اسی طرح تین عالم ہیں عالمِ جسمانی، عالمِ روحانی اور عالمِ عقلانی۔ پھر ان کے نور اور ظلمت بھی اسی طرح ہیں یعنی ظلمتِ طبیعی، اسکے مقابلے میں نورِ طبیعی، پھر ظلمتِ روحانی، اس کے مقابلے میں نورِ روحانی، پھر ظلمتِ عقلانی اور اسکے مقابلے میں نورِ عقلانی ہے۔

اس کے بعد اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے ان روحانی بھائیوں سے مخاطب ہوتا ہوں جو اس مختصر کتاب کو پڑھتے ہوں، جس طرح ان کے پاس اس حقیقت کی دلیلیں موجود ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے

اس عقیدے کی تصدیق کرتا ہوں کہ امامِ زمان ہی اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔ جس طرح اس دنیا کو روشنی پہنچانے والا سورج ہمیشہ موجود ہے اسی طرح امامِ زمان عالمِ دین کو روشنی بخشتا ہوا ہمیشہ موجود ہے۔ سورج کا دنیا سے ناپید ہونا ممکن نہیں اسی طرح امامِ زمان لوگوں کے درمیان ہمیشہ حاضر رہتا ہے۔ اس لئے کہ انسان جسم و روح اور عقل تین چیزوں سے مرکب ہے، جسمِ خاکی کیلئے یہی سورج، چاند، ستاروں اور دوسرے روشنی کے ذریعوں سے روشنی ملتی رہتی ہے۔ لیکن انسانی روح اور عقل کو جس روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ روشنی صرف امامِ زمان کے پاس ہر وقت موجود ہے۔ مگر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ روح اور عقل کی روشنی اس جسمانی آنکھ سے دیکھی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ اگر اس آنکھ سے وہ نور دکھائی دیتا تو اس نور کو تمام دنیا والے دیکھ سکتے اور کوئی شخص انکار نہ کرسکتا، کیونکہ اس دنیا کے سورج سے کوئی منکر نہیں ہے، اسلئے کہ اس کا نور دکھائی دیتا ہے اور اس میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ یہ سورج ہے یا نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے۔ اگر اللہ کا یہ نور ظاہری طور پر چمکنے دمکنے یا اور کسی ظاہری نشان کے ساتھ ہوتا جس کے دیکھتے ہی لوگ سمجھ سکتے کہ یہ خدا کا نور ہے تو اللہ یہ نہ فرماتا کہ میں جسے چاہتا ہوں اپنے نور کی طرف راستہ بتلاتا ہوں۔ چنانچہ آیۂ نور میں نورِ خداوندی کی تفصیل بیان ہے۔ قولہٗ تعالیٰ:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۴:۳۵)۔

ترجمہ: "اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اسکی روشنی کی مثال ایک طاق کی مانند جس میں چراغ ہو۔ چراغ شیشے میں ہو۔ شیشہ چمکتے ہوئے تارے کی مانند سلگتا ہے۔ زیتون کے مبارک درخت سے وہ مشرق کا نہیں اور نہ مغرب کا ہے۔ اس کا تیل خود بخود سلگتا ہے۔ اگرچہ اسے آگ نہ بھی لگے۔ روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ جسے چاہے اپنی روشنی کی طرف راستہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ تمام چیزوں کا جاننے والا ہے۔"

اللہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تشریح

اللہ آسمانوں اور زمینوں کی روشنی ہے، یعنی اللہ کے وجودِ مطلق میں کُل عالم سمویا ہوا ہے، اپنی تمام صفات کے ساتھ جو اسمیں موجود ہیں، اس سے کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں، وہ کُل اشیاء کو دیکھتا اور اپنی روشنی میں دکھا سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں کُل عالم اسطرح دکھائی دیتا ہے جسطرح کوئی صاف شیشے کا گلوب سورج کی روشنی میں۔ اس کی رحمت اور علم میں ہر چیز اسطرح سموئی ہوئی ہے جسطرح ایک شفاف چیز سورج کی روشنی میں مستغرق ہوتی ہے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا۔ (۴۰: ۷) ترجمہ: "اے ہمارے پروردگار! ہر چیز تیری رحمت اور علم میں سموئی ہوئی ہے۔"

اس آیت میں بہت سی حقیقی تعلیمات ہیں، لیکن یہاں پر اسقدر تشریح کافی ہے۔ صرف ایک بات جو بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے تو ہمیں اس کی مثال اس طرح سمجھنی چاہیئے کہ آسمان اور زمین جسم ہے اور جسم کے ذرّات ہوتے ہیں، بالفاظِ دیگر ذرّات کے مجموعے کا نام جسم ہے تو اِن ذرّوں کو مجموعی طور پر عالم یا آسمان اور زمین کہا جاتا ہے۔ پھر جب روحانی طور پر

کُل عالم میں اللہ کی روشنی موجود ہو تو نتیجۃً یہ کہنا درست ہوگا کہ اِس عالم کی دو صورتیں ہوئیں: ایک صورت نورانی یعنی وہ صورت جو خدا کی روشنی میں نظر آتی ہو۔ دوسری صورت ظلمانی یعنی وہ صورت جو انسانی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ چونکہ انسان پوشیدہ، تاریک اور دُور کی چیزوں کو نہ دیکھ سکنے کے علاوہ دکھائی دینے والی چیزوں کو بھی حقیقی نظر سے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ پھر یہی عالم کی نورانی اور ظلمانی دو صورتیں ہونے کی وجہ سے یہ ثابت ہوا کہ اِس عالم میں ایک اور عالم پوشیدہ ہے، جو اس سے زیادہ روشن تو ضرور ہے لیکن شکل و صورت یعنی ترکیب اور وضع میں اسی عالم کی مانند ہے۔ اس قول کی سچائی اس آیت سے ملے گی۔ قولہٗ تعالیٰ: سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ (۵۷: ۲۱) ترجمہ: "ایک دوسرے سے آگے بڑھو اپنے پروردگار کی بخشش اور ایک باغ کی طرف جس کا پھیلاؤ (یا دیکھنا۔ عرض) آسمان اور زمین کی طرح ہے۔ یہ ان لوگوں کیلئے تیار کر رکھا ہے جو ایمان لائے اللہ اور اسکے رسولوں پر۔" یقیناً نورانی صورت میں یہی عالم ہے۔ وہ باغ جسکا پھیلاؤ یا دیکھنا آسمان اور زمین کیطرح ہے۔

اُس کے نور کی مثال

کسی قریبی مشابہت والی چیز سے حکمت کے حل و عقد کا نام مثل ہے، یعنی معلوم کو نامعلوم اور نامعلوم کو معلوم کرنے والی بات کو مثل کہتے ہیں اور اس سے جو چیز مقصود ہو، اسے ممثول کہتے ہیں۔ مثل اور ممثول میں بہت فرق رہتا ہے، یعنی جب کسی روحانی چیز کی مثال جسمانی چیز سے دی جائے تو اس میں رُوحانی چیز زندہ اور جسمانی چیز مقابلۃً مُردہ ہونے کی وجہ سے اور بھی مثالوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ چنانچہ رُوح کی مثال دُنیا کی ساری چیزوں سے دی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ روح میں ساری چیزوں کی

خاصیّت موجود ہے، یہی وجہ تھی کہ اس دنیا کی محسوس چیزوں سے جتنی مثالیں ممکن تھیں، اُن کو قرآن شریف میں طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ قولِ خدا اِس حقیقت کا گواہ ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸:۵۴)۔ ترجمہ: "اور تحقیق ہم نے اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر ایک مثال کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور انسان بہت سی چیزوں پر بحث کرتا ہے۔"

چراغ دان کی مانند

جس میں چراغ رکھا ہو چراغدان کہتے ہیں، چراغدان، (مشکوٰۃ) نفسِ کُل ہے، کیونکہ چیزوں کے اٹھانے اور جسم کے بنانے والا وہی ہے اور یہ دنیا جو خدائی نور کے چراغ کے طاق یا کہ چراغ پائے کی طرح ہے نفسِ کُل کیلئے جسم کی مانند ہے۔ چرغدان وہاں رکھا جاتا ہے جہاں زیادہ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح یہی دنیا ہے جس میں نور کی زیادہ ضرورت ہے، اس لئے امامِ زمان جو اس نور کے چراغ ہیں دنیا میں اور لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور شرف کی اونچائی سے روشنی دیتا ہے۔ بلندی دو قسم کی ہوتی ہے: شرفی اور مکانی۔

چراغ شیشے میں ہے

چراغ امامِ زمان ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا میں ہمیشہ زندہ اور حاضِر ہے۔

شیشہ تارے کی مانند چمکتا ہے

چراغ کی روشنی کے حفاظتی شیشہ ناطق یعنی حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم ہیں کہ ناطق جو چراغ کے شیشے کی طرح نورِ امامت کی حفاظت کرتا ہے۔ یعنی

اگر ناطق دعوتِ ظاہر کو اپنی طرف سے نہ دکھاتا اور قیامت تک امام کے اسرار کو نہ چُھپاتا تو امام کو جسمانی تکلیفیں ہوتیں اور جسمانی تکلیف کی وجہ سے امامت چلانے میں فرق آتا۔ جس طرح کسی لالٹین کا شیشہ نہ ہونے سے روشنی میں فرق آتا ہے۔ تارے کی طرح شیشہ چمکنے سے یہ مراد ہے کہ ناطق نے امام سے نور حاصل کیا اور اسی نور میں اس کو چھپا لیا دیکھنے والے نے یہ قیاس لگایا کہ یہ کوئی چمکتا ستارہ ہے جو یک لخت اور اس کے اندر کوئی جوف نہیں، جو روشنی اور چمک دمک نظر آتی ہے وہ اس ستارے کی ہے۔ واقعی ظاہری طور پر اسی طرح ہوا یعنی اسکا مطلب یہ ہے کہ باطنیت میں حضرت مولانا مرتضیٰ علیؑ جو خدا کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان اور دل وغیرہ سب کچھ تھے۔ اسلئے خدائی کی تمام صفات اور تمام کام حضرت مولانا مرتضےٰ علیؑ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے سپرد تھے۔ پھر اس لئے جناب پیغمبر کی وحی و الہام، کشفِ دیدار، اور تعلیم وغیرہ سب مظہر العجائب و الغرائب ہی سے آنحضرت کو میسّر ہوئی تھی۔ لیکن بطریقِ حکمت اِن تمام باتوں کو راز میں رکھی جاتی تھیں اور نبوت کے سلسلے میں یہ سب آنحضرت سے ظہور پذیر ہوتا تھا، یہی مثال ہے جسمیں کہا گیا ہے کہ خدائی روشنی تو چراغ میں ہے لیکن چراغ کا حفاظتی شیشہ اس کے اندر کی روشنی کی وجہ سے اس قدر تابان و درخشان ہے کہ خود مجوّف یعنی اندر سے خالی شیشہ ایک کروی شکل کے چمکتے ہوئے تارے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

کیا تعجب کا مقام ہے کہ آپ شمس تبریز اور مولائے روم جیسے بزرگوں کی کتابوں کا ذرا مطالعہ کیجئے۔ فوراً آپ کو یہی حقیقت وہاں بھی نظر آئے گی۔ چنانچہ مولانا رومؔ فرماتے ہیں:

محمّد بود قبلہ گاہِ عالم
ولی بر تخت دل سلطان علی بود

معنی: ساری دنیا کیلئے حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تو خانہ کعبہ کے رتبہ میں تھے

لیکن اس کے دل کے تخت پر مولانا علی بادشاہ تھے۔

تیل جلتا ہے

اس چراغ کا تیل عقلِ کُل ہے، تیل جلنے پر روشنی بنتی ہے، عقلِ کُل سے روحانی عقدے کھل جاتے ہیں۔

اس مبارک زیتون سے جو وہ نہ مشرق کا ہے نہ مغرب کا

وہ درخت جس سے عقلِ کُل پیدا ہوَا، امرِ کُل ہے، چونکہ وہ مشرق اور مغرب یعنی عقلِ کُل اور نفسِ کُل سے برتر ہے۔

سلگ جاتا ہے اس کا تیل بغیر آگ لگائے

آگ کہتے ہیں عقلِ کُل کی تائید کو، اور اس چراغ میں تو ہمیشہ عقلِ کُل تیل کی مانند بھرا ہوَا ہے۔ خود اس میں تائید موجود ہے اس کیلئے اور تائید کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تیل سے توحید کی روشنی نکلتی رہتی ہے۔

روشنی پر روشنی ہے

نور کی دائمیت کے مقابلے میں جسم مستحیل اور متبدّل ہے۔ نیز تقاضائے قانونِ فطرت کی وجہ سے اسے فنا پزیر ہونا لازمی ہے۔ اس لئے امامِ زمان ہر شخصی دَور کے بعد اپنا جسمانی جامہ بدلتا رہتا ہے (اس لحاظ سے گذشتہ جامہ کے شخصی دَور کے کائنات سے متعلق عقلانی عمل کی صورتِ نورانی پر موجودہ جامہ کا اپنے زمانے کے لوگوں سے متعلق وہی عقلانی عمل کی نورانی صورت بڑھ جاتی ہے) کیونکہ نور کا دوسرا نام عقلانی عمل ہے۔ اسکی مثال

ایسی ہے کہ کسی فرشتہ جلالی نے عقل کے قلم سے روح کی کتاب میں کُل مخلوقات کے ایک دن کا مجموعی عمل حکمت کے انداز میں درج کرلیا۔ جو اِس کتاب کا ایک باب بن گیا۔ اسی طرح روزانہ ایک ایک باب لکھتا گیا۔ لکھنے کی طاقت تو اس جلالی فرشتہ میں موجود ہے۔ لیکن جوں جوں مخلوقات سے عمل وقوع میں آتے ہیں، توں توں یہ لکھتا جاتا ہے۔ اسی طرح اسکے اس عمل کو "باب پر باب" کہا جاسکتا ہے۔

روشنی پر روشنی کہنے کا مطلب اسی طرح ہے۔ ورنہ اگر بالفرض نور یعنی روشنی روز بروز بڑھتی جائے تو اِس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ نور ازل میں ناقص تھا، اب کامل ہو رہا ہے۔ کوئی دانا شخص اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ ہاں جس طرح میں نے اوپر کی مثال میں بتایا کہ عقل کا عمل زمانہ اور لوگوں کی استعداد اور ان کی قابلیت کے مطابق ہوتا رہتا ہے، اس لئے امامِ زمان ظاہراً اپنا تمام کام ایک دن میں ختم نہیں کرتا ہے۔

روشنی پر روشنی کہنے کی حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص خدائی نور کی ابتداء اور انتہا کے بارے میں سوال کرے، تو اسے جواب ملتا ہے کہ نور کا سلسلہ لاانتہا ہے۔ اس لئے کہ روشنی پر روشنی کہنے کا جو منطقی قانون ہے، اگر ہم اس کو بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں نور کی لاابتدائی اور لاانتہائی ہے۔ کیونکہ خدا کے نور کی موجودیت کے قوانین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نور پر نور ہوتا ہے۔ اس صورت میں آپ یہ سمجھیں کہ ہر ایک نور سے پہلے ایک نور کا ہونا لازمی ہے۔ تاکہ بعد کے نور کو اس قانون کے لحاظ سے پہلے کے نور "پر" کہنا درست ہوسکے اور اسکے پہلے کے نور کو بھی "پر" کہلانے کیلئے قبلاً کوئی نور کا ہونا لازمی ہے اور اِس سلسلے کا کوئی آغاز نظر نہیں آتا۔ پھر موجودہ نور پر ایک اور نور کا ہونا ضروری ہے تاکہ روشنی "پر" روشنی کہنا بجا ہو۔ اس کی کوئی انتہا ثابت نہیں ہوسکتی ہے۔

یہی مطلب دوسرے الفاظ میں ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ "نور پر نور ہوتا

ہے"اس کا عکسی مطلب یہ ہوا کہ نور کے بغیر نور نہیں ہوتا، یعنی جب تک پہلے نور نہ ہو تو بعد میں نور نہیں ہو سکتا۔ اس کی بھی یہی حقیقت ہوئی کہ نور سے پہلے بھی نور ہو اور بعد میں بھی نور ہو۔ اس طرح اگلی اور پچھلی طرف سے غیر منقطع طور پر نور کا ہونا لازمی ہے تاکہ ہر نور کو ایک طرف سے علیٰ (پر) اور دوسری طرف سے تحت (نیچے) کہنا حقیقتاً ٹھیک ہو سکے۔

اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے جس کو چاہتا ہے

ہدایت کے معنی ہیں راستہ دکھانا۔ کسی کو راستہ دکھانا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب کہ راستے پر چلنے والا شخص راستہ نہ جانتا ہو، اور اسے اس راستے پر چلنا ضروری ہو تو اس وقت اس کو تین طریقوں سے راستہ دکھایا جا سکتا ہے۔ اسلئے راستہ دکھانا یعنی ہدایت تین قسم کی ہوتی ہے: عملی ہدایت، قولی ہدایت اور تحریری ہدایت۔ عملی ہدایت یہ ہے کہ ہادی یعنی خود راہ دکھانے والا اس ناواقف راہی کے ساتھ منزلِ مقصود تک چلے۔ قولی ہدایت یہ ہے کہ ہادی راہ جُو کو راستے کے متعلق سمجھائے اور اسکے نشان وغیرہ بتائے پوری تفصیل سے جو وہ اس ناواقف راہ رو کیلئے ضروری سمجھتا ہو اور تحریری ہدایت وہ ہوتی ہے کہ اس مسافر کے راستہ کے متعلق کوئی تفصیلی پہچان ہو یا کوئی نقشہ ہو جس سے مسافر منزلِ مقصود تک پہنچ سکے لیکن ان تینوں قسم کی ہدایتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی مسافر تحریری ہدایت سے فائدہ اُس وقت اٹھا سکتا ہے جبکہ وہ خواندہ ہو۔ اور اس کو کسی قسم کی غلطی ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ ورنہ اسے گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔ قولی ہدایت میں بھی مسافر کو راستے سے متعلقہ باتیں بھول جانے یا ان کو نہ سمجھنے کا خطرہ ہے۔ پھر دینی اُمور کی ہدایت کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن روحانی

ہدایت کے لحاظ سے لوگ تین قسم کے ہیں۔ (۱) انبیاء (۲) اولیاء (۳) عوام۔ اس صورت میں تحریری ہدایت یعنی آفاق و انفس کی مرقوماتِ صنعت اور ظاہری کتاب انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ الہام و القاء اور کلامِ غیبی کی قولی ہدایت اولیاء کیلئے ہے اور عوام کیلئے جو ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ہادی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ انہیں عملی ہدایت کریں جو کہ عوام کیلئے سب سے زیادہ آسان اور بے خطر ہدایت ہے۔

اور اللہ لوگوں کو مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں

اور اللہ لوگوں کو مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ مثل سے ممثول کی دلیل لیں، وہ غور کریں کہ اللہ کے نور، چراغدان، چراغ، شیشہ، تارا، جلنا، درختِ زیتون، تیل، آگ اور ہدایت وغیرہ کہنے کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ صرف یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے تو اس میں کون انکار کرسکتا ہے۔ اگر اسکے آسمان و زمین کی روشنی ہونے میں ہمارا کوئی انکار نہ ہو تو اس مثال سے ہمیں کیوں سمجھانا چاہتا ہے۔

ISW
Spiritual Wisdom
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

دربیانِ علم

ترجمہ از کلام حضرت حکیم سیّد شاہ ناصر خسرو قدّس اللہ سرّہٗ

سب سے پہلے مومن کو یہ جاننا چاہیئے کہ علم کیا ہے؟ جب وہ اسے پہچان سکے تو اس کو حاصل کر سکے گا، کیونکہ جب تک کوئی شخص کسی چیز کو نہ پہچان سکے تو اس چیز تک اسکی رسائی ہرگز نہیں ہوتی۔ پھر میں تجھے بتاؤں گا کہ چیزوں کو ویسی کی ویسی دریافت کرنے کو علم کہتے ہیں۔ چیزوں کو اصلیت سے جاننے والا عقل ہے اور علم عقل کے گوہر میں ہے اور عقل کی گواہی باری سبحانہٗ وتعالیٰ کا کلمہٗ ہے جس کے نیچے تمام روحانیاں اور جسمانیاں ہیں اور جو کچھ علم کے تحت نہ آئے اُسے ہست نہیں کہنا چاہیئے۔ جب یہ روا نہیں کہ خدا تعالیٰ علم کے تحت ہو اور علم وہ ہے کہ چیزیں اور ہستیاں سب اسکے نیچے ہیں اور نیستی بھی اس کے نیچے ہے تو روا نہیں جو میں کہوں کہ خدا ہے یا نہیں اس لئے کہ ہستی اور نیستی علم کے تحت ہے اور خدا علم کے تحت نہیں۔

پھر میں بتاؤں گا کہ علم محض (خالص علم) خدا کا امر ہے، اور جس کو دوسرے کی نسبت علم کا زیادہ حصّہ ملا ہے وہی نسبتاً خدا کے امر کے زیادہ نزدیک ہے اور خدا کے امر کو زیادہ قبول کیا ہے اور زیادہ فرمانبردار ہے اور جو کوئی دوسروں کی نسبت زیادہ دانا ہو جائے خدا کا زیادہ مطیع ہوتا ہے اور جو کوئی پورا دانا ہو جائے تو وہ ہمیشگی کی نعمت کو پہنچتا ہے، چونکہ دانا کا انجام کار خدا کی رحمت ہے۔ انسان عالم کی تمام مخلوقات

سے اخیر میں پیدا ہوَا ہے اور اس کا مرجع یعنی واپس جانے کی جگہ اَمر ہے جو کہ وہ دونوں جہان کی علّت یعنی سبب ہے اور چیزیں اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہیں۔

بھائیو! علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو، جس سے تم اللہ کے زیادہ نزدیک ہو جاؤ گے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی رحمت علم ہے۔

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

حُدود ایک وقتِ معیّن تک ہیں

طالبِ حقیقت کو نہایت ہی ضروری ہے کہ وہ حدودِ دین کے بارے میں پوری علمیت حاصل کرے کہ حدود کس ضرورت کیلئے ہیں، کیا وہ ہمیشہ کیلئے ہیں یا ان کی برخاستگی کا کوئی وقت ہے ؟

میں اس موقعہ پر حدود کی ایک حقیقی تفصیل پیش کرتا ہوں جو آفاق وانفس کی نشانیوں کی دلیلوں پر مبنی ہوگی۔ اس لئے کہ جس بات کی دلیل یا گواہی آفاق وانفس سے نہیں مل سکتی وہ محض جھوٹ ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت رسول اکرم صلعم کی حدیث ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ اَسَّسَ دِیْنَہٗ عَلٰی مِثَالِ خَلْقِہٖ لِیُسْتَدَلَّ بِخَلْقِہٖ عَلٰی دِیْنِہٖ وَبِدِیْنِہٖ عَلٰی وَحْدَانِیَّتِہٖ۔ ترجمہ: "اللہ نے اپنے دین کی بنیاد اپنی مخلوقات کی مانند رکھی تاکہ اس کی مخلوقات ہی سے اسکے دین کی دلیل مل سکے اور اس کے دین سے اس کی یگانگی کی دلیل مل سکے۔" اس حدیث میں تینوں عالم کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ تینوں عالم ایک دوسرے کی مثال ہیں: یعنی عالمِ خلق، عالمِ دین، اور عالمِ وحدت۔

اور یہی حقیقت سمجھانے کیلئے کہ جب تک آفاق وانفس کسی قول کی سچائی پر گواہی نہ دیں تو وہ قول ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ قرآن شریف کی آیت ملاحظہ ہو: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ۔ (۱۸:۵۱) ترجمہ: "ہم نے ان کیلئے آسمانوں اور زمین کی آفرینش سے گواہی نہیں دی اور نہ اُن کی جانوں کی

آفرینش سے۔" پھر عقل والوں کو لازم ہے کہ دین سے متعلقہ جو بات ہو اسے ظاہر کرنے سے پہلے اس کائناتی شہادت سے محکم کریں۔

چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ امامِ زمان عالمِ دین میں ہمیشہ حاضر اور دائم فیضِ روحانی بخشتا ہے، تو یہ بات صحیح ہے، کیونکہ دنیا میں بھی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے دنیا میں موجود ہے اور روشنی بخشتی رہتی ہے وہ سُورج ہے۔ امامِ زمان اس دنیاوی سُورج کا ممثول ہے اور سُورج امامِ زمان کی مثال ہے، لیکن معلوم ہو کہ مثال اور ممثول میں فرق ہوتا ہے، پھر اس کے بعد سُورج کی جملہ صفات اور افعال سے امامِ زمان کی قریبی مثال لی یعنی سُورج جب ہم سے دُور ہوتا ہے اُس وقت تاریکی ہونی شروع ہوتی ہے، پھر سُورج کی طرف سے ہمیں چاند روشنی دیتا ہے اور اگر یہ بھی ہم سے دُور ہو یا اس کا رُخ ہماری طرف نہ ہو تو ہمیں تاروں سے روشنی ملتی ہے، پھر بعض اوقات بادل کی وجہ سے تاریکی ہی رہتی ہے اور جب سُورج نکلے تو ہمیں چاند روشنی نہیں دے سکتا ہے، مگر وہ ہمیشہ اپنے لئے نور حاصل کرتا ہے، اسی طرح تارے بھی سُورج نکلنے پر ہمیں نظر نہیں آتے، چاند اور تاروں میں اپنے لئے روشنی ضرور موجود رہتی ہے، کیونکہ ان کے اور سُورج کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ زمین سے بہت اونچائی پر ہے۔

صفحۂ کائنات کی مذکورہ شہادت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جب زمانہ والوں کی روحانی رسائی امام تک نہ ہو تو اس وقت امام کی طرف سے حُدود مقرر ہوتے ہیں جن کا ذکر اس سے آگے ہو چکا ہے، حُدودِ سفلی میں سے حجّتِ اعظم جو چاند کے مقابلے میں ہے اور دوسرے حجّت، داعی اور ماذون تک تاروں کے مقابلے میں ہیں، عالمِ دین کو علمِ دین سے روشنی دیتے ہیں۔ اور جب امامِ زمان دینی لحاظ سے لوگوں کے نزدیک ہو جائے تو حُدودِ سفلی کی پہچان باقی نہیں رہتی۔ ہاں جس طرح ستارے دن کے

وقت نیست و نابود نہیں ہوتے لیکن ہمیں ان سے ظاہری طور پر کوئی روشنی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اسی طرح حُدود بھی تو ہر وقت موجود ہیں اور اپنی ذات کے لئے روشن بھی ہیں۔ حجّت کی مثال بھی اسی طرح ہے جس طرح دن کے وقت چاند کی۔ قولہٗ تعالیٰ: وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۸۱:۲)۔ یعنی "جب ستارے دیکھنے میں غیر شفاف ہوں۔" وَخَسَفَ الْقَمَرُ (۷۵:۸)۔ "اور چاند گہہ جائے۔" وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۷۵:۹)۔ "اور جس وقت سورج اور چاند ایک ہو جائیں۔" یہی علامت حدودِ ظاہری کے اشخاص نہ دکھائی دینے کی ہے یعنی روزِ قیامت کے قریب ہونے پر امام کے سوا باقی تمام جسمانی حدود ظاہراً نہ دکھائی دیں گے اور حجّت امام کے ساتھ ایک ہو گا۔

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ حدودِ علوی و سفلی کے بارے میں علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ علمِ تاویل جو مومن کی روح کے حق میں باعثِ عروج ہے علمِ حُدود کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ بمثالِ آیتِ کریمہ: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷:۳)۔ اوّل اسے کہتے ہیں جس کا فی الواقع کوئی آغاز ہو۔ آخر اسے کہتے ہیں جو فی الحقیقت آخر میں پیدا ہوا ہو۔ ظاہر بحقیقت وہ ہے جو حواسِ خمسہ سے پانچوں حسّ یا کم از کم ایک حسّ سے محسوس کیا جا سکے۔ کیونکہ لفظ کیلئے حد مقرر ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کو باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ کی قوتوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن سامعہ کا اس میں حصّہ نہیں۔ لیکن کسی خوشبو یا بدبُو جب اس کا نکاس سامنے نہ ہو تو صرف قوّتِ شامّہ کی مدد سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مختصر ظاہر جسم ہے اور جسم محسوس ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص لفظ کو اپنی حد سے بدل دے تو وہ ظلم ہے، لہٰذا ظاہر کے معنی وہ ہیں جو جسم رکھتا ہو اور محسوس ہو۔ باطن وہ ہے جو محسوس نہ ہو اور اسے عقل کی قوتوں سے معلوم کیا جا سکے۔ چنانچہ اسکی تاویل یوں ہوئی کہ اوّل عقلِ کُل ہے کیونکہ یہ ہر چیز سے اوّل ہے اور ہر لحاظ سے اوّل ہے۔ آخر

نفسِ کُل ہے، چونکہ اوّل کے بعد آخر ہے اور یہ عقلِ کُل (جو اوّل تھا) کے بعد پیدا ہوا۔ نیز سب سے آخر ہے، کیونکہ اس کی اتمام اس وقت ہوگی جب قائم ظہور کرے۔ ظاہر ناطق ہے، کیونکہ اس کی تنزیل شریعت، دعوت اور مرتبہ سب کچھ ظاہر ہے اور محسوس ہے اور خود بھی جو امام کی شخصِ اطہر (جسم) ہے۔ باطن امام ہے، کیونکہ اس کی تاویل، دعوت اور مرتبہ سب کچھ باطن ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ناطق تو فی الحال ظاہر نہیں اور امام ظاہر ہے، پھر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کیلئے جواب یہ ہے کہ امام مجمع الحُدود ہے یعنی اسکے پاس تمام حُدود موجود ہیں۔ اس آیت میں امامِ زمان کی ظاہری شخصیت کو ناطق کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے، اور امامِ زمان کے اپنے مرتبے کو باطن کہا گیا ہے۔ اسی طرح حُدود کے بغیر تاویل برابر نہیں آتی ہے۔ اس لئے اگرچہ امامِ زمان کے علاوہ ظاہراً کوئی حُدودِ سفلی نہ بھی ہو۔ لیکن پھر بھی علمِ حُدود ضروری ہے تاکہ حُدود شناسی کے بعد خدا شناسی حاصل ہوسکے۔

حُدود دان چہ نباشی خدائے دان نشوی

سورج نکلنے کے بعد اگرچہ چاند اور تاروں سے ہمیں کوئی روشنی نہیں آتی ہے لیکن چاند اور تاروں سے متعلق علم ضرور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔

امامِ مبینؑ

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۱۲)۔ قرآنِ شریف کی معنوی و باطنی بے پایان گہرائیوں کا اندازہ کرنے کیلئے رسول اللہؐ کی یہ حدیث کافی ہوگی: مَا مِنْ اٰيَةٍ مِنْ اٰيَاتِ الْقُرْاٰنِ اِلَّا وَلَهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِبَطْنِهٖ بَطْنٌ اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِلٰى سَبْعِيْنَ بَطْنًا۔ ترجمہ: قرآنِ پاک کی آیتوں میں سے کوئی ایسی آیت نہیں جس کا ایک ظاہری اور دوسرا باطنی معنی نہ ہو۔ اور اس باطنی معنی کے اندر سات معنی ہیں۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق ستّر معنی ہیں۔ وَقَالَ النَّبِيُّ لِكُلِّ حَرْفٍ مِنْ حُرُوْفِ الْقُرْاٰنِ حَدٌّ وَّلِكُلِّ حَدٍ مَطْلَعٌ۔ ترجمہ: قرآن کے حُروف میں سے ہر ایک حرف کی ایک حدّ ہے اور ہر ایک حدّ کا ایک زینہ ہے۔ اس حدیث سے ہمیں یہ تعلیم مل جاتی ہے کہ جب کسی شخص کو قرآنِ شریف کا مطالعہ کرنا ہو تو طائرانہ نظر سے نہیں بلکہ غائرانہ نظر سے قرآنِ پاک کو پڑھے اور غور و فکر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ پاک نے بھی قرآنِ پاک کو آہستگی اور غور و فکر سے پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ذیل کی آیت میں معنوی لحاظ سے قرآن پڑھنے والوں کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں: ایک وہ جو ضروری حد تک تاویل جانتے ہیں۔ دوسرے وہ جو پڑھتے تو ہیں لیکن غور و تدبّر نہیں کرتے۔ تیسرے وہ ہیں جو غور و خوض سب کچھ کرتے ہیں لیکن دلوں پر قرآن کے قفل لگے ہوئے ہیں۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷:۲۴)۔

اسرارِ قرآن کے حصول کیلئے جو واحد راستہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ شریف کو خدا و رسولؐ نے جس اُصول سے ہمیں پڑھنے کا حکم فرمایا ہے اس اُصول سے پڑھیں، وہ اُصول اور کچھ نہیں صرف امامِ زمان کی حقیقی اطاعت ہے۔ اگر ہم کسی آیت کے ظاہری معنی لیتے ہوئے امامِ زمان کی اطاعت نہ کریں تو ضرور اس آیت کی پوشیدہ حقیقت ہمارے حق میں پوشیدہ ہی رہے گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک انجان مسافر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے ایک شخص کو اپنا رہبر بناتا ہے، جو راستے سے بخوبی واقف ہے، اب دونوں چلتے ہیں، راستے کی کچھ مسافت طے کرنے کے بعد ایک دوراہہ پر پہنچتے ہیں، راستہ دکھانے والے کو ان دونوں کے متعلق ذرّہ ذرّہ معلوم ہے کہ دونوں راستوں میں سے ضروری اشیاء کی فراوانی، خطروں سے محفوظیّت اور نزدیکی وغیرہ کے لحاظ سے کون سا راستہ اچھا ہے، اس نے کئی مرتبہ دونوں راستوں کو دیکھا، جانچا اور اس کے رنج و راحت کا کُلّی توازن کیا ہوا ہے۔ لیکن وہ مسافر بھی ایسا ہے کہ اپنے راہبر کی ذاتی خصوصیات کا کچھ علم نہیں رکھتا۔ اس لئے اپنی عقل سے دونوں راستوں کی طرف نگاہ ڈالتا ہے۔ منزلِ مقصود بہت دُور ہے اور اس کی نگاہ محدود ہے۔ اس لئے وہ سامنے دیکھتا ہے تو اسے ایک راستہ ذرا کھلا نظر آتا ہے۔ اسی وقت راستہ بتلانے والا شخص دوسرے راستے سے چلتا ہے جسمیں ہر قسم کی آسائش ہے اور مسافر اس راستہ دکھلانے والے پر اعتماد کئے بغیر اپنے پسندیدہ راستے سے اکیلا چلتا ہے اور راستے میں اسے بہت تکلیفیں ہوتی ہیں۔

اللہ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن نے اپنی لاانتہا رحمت سے انسانوں کیلئے وہ تمام اسباب مہیّا و موجود کئے ہیں جن کا ہونا حصولِ دین و دنیا کیلئے ضروری تھا۔ جس طرح خود فرماتا ہے کہ: وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴)۔ ترجمہ: اور دیا اُس نے تم کو ہر وہ چیز جو تم نے مانگی یا تمہاری

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

حالت سے جس چیز کی ضرورت معلوم ہوتی تھی اور اگر تم خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو گنو گے تو تم انہیں اپنے علم میں گھیر نہیں سکو گے۔

اب سُن لیجئے یہ آیت محکم نہیں بلکہ متشابہ ہے، اس کے متشابہ ہونے کی حد میں آپ کو بتوفیقِ خداوند دکھا سکوں گا۔ مذکورہ آیت کے معنیٰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری مطلوبہ اشیاء یا نعمتیں ہمیں اس دنیا میں دی گئی ہیں اور دینے کا فعل ختم ہو چکا ہے اور وہ چیزیں سب کی سب ہماری طلب کی وجہ سے دی گئی تھیں اور اگر ان نعمتوں کو ہم گن لیں تو وہ اسقدر بے انتہا ہیں کہ انہیں ہم گن بھی نہیں سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کو ہمیں جتلاتا ہے، حالانکہ ہم سب مسلمان ظاہری نعمت میں ان لوگوں سے بھی بہت پیچھے ہیں جو خدا کی ہستی کو بھی ابھی تک نہیں مانتے۔ پھر اللہ کا ہم پر کیا احسان ہوا؟ پھر یہ برابر نہیں آتا۔ نیز ہماری طلب بھی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ اللہ کا دینا ختم ہوا ہے۔ اور نہ یہ درست ہو سکتا ہے کہ محض لفظی طلب سے کوئی شے ملتی ہے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ظاہری نعمتوں کو بغرضِ شکر گزاری کوئی دانا گِننا چاہتا ہو۔ کیونکہ گنتی ان چیزوں کیلئے ہے جو ایک سے دوسری چیز جدا ہو۔ جیسے تسبیح کے دانے یا اس قسم کی کوئی اور شے۔ ہماری حیات میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے درمیان میں کوئی فصل یعنی جُدائی نہیں۔ مثلاً زندگی، علم، عقل، ایمان وغیرہ۔ پھر معلوم ہوا کہ اس آیت کیلئے تاویل کے بغیر چارہ نہیں۔ یاد رکھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسانی مَبدَاَ سے لیکر مَعَاد تک کُل حالتوں پر واقع ہے۔ اس مطلب کو اور بھی آسان تر کرنے کیلئے کہتا ہوں کہ اس آیت سے ان روحانیوں کی حالت کا کچھ علم حاصل ہوتا ہے جو عالمِ روحانی کی لاانتہا حدود میں سے ایک منتقلی حدّ پر پہنچ چکے ہیں۔ اس حدّ میں انکی مراد کی تمام چیزیں ان کے پاس موجود ہیں۔ وہاں پر اللہ پاک انہیں فرماتا ہے کہ تمہیں دی گئی ہے "کُل" (امام) سے ہر چیز جو تم نے عملاً طلب کی اور اگر تم روحانی و

جسمانی دفعات کو انتقالِ بقا کے عمل سے گنو گے تو انہیں ختم نہیں کر سکو گے۔ پھر آگے دو لفظوں میں دفعاتِ لاانتہا کی وجہ بیان کرتا ہے۔ انسان اپنے جسم، روح اور عقل میں برابری نہیں رکھ سکتا۔ یعنی برابری سے مراد کسی ایک حدّ میں رُک جانا اور تینوں عالم کی سیر کو ختم کرنا۔ اس حقیقت کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ترازو میں کمی بیشی کرے تو تولنے کا عمل ہرگز ختم نہیں ہوگا۔ جب تک حقیقی برابری نہ ہو تو ترازو کی حرکت جاری رہتی ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسان کی سرشت کوئی ایسی نہیں کہ وہ ایک حدّ میں جا کر حصولِ نعمت سے تھک جائے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر انسان روحانیت کو بشرطِ خود حاصل کرے تو ایک لاانتہا دائرے پر لاغایت نعمتوں میں دائمی عروج کرتا رہتا ہے۔

جن دوستوں کو تاویل کی واقفیّت نہیں، انہیں یہ باتیں سمجھنا بہت سخت کام ہے اور اُوپر کے بیان کے مطابق دنیا میں عمل کریں۔ جس طرح فرمایا گیا ہے کہ تمہیں

کُل یعنی امامِ زمان ہی سے ہر وہ چیز دی جائے گی جسے تم عملاً طلب کرو گے۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو امامِ زمان میں نہ ہو۔ اگر عمل شائستہ کر کے کسی چیز کا حقدار بنے تو جو چیز یہاں ملنے والی ہو تو یہاں ملے گی اور جو چیز اُس جہان میں ملنے والی ہو تو وہاں ملے گی۔ اگر اچھے کام کئے جائیں تو ہمارے نیک عمل کا پھل ہمیں بغیر طلب کے بھی دیا جائے گا۔ میرے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اپنے امامِ زمان کی مہربانیوں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ نیز انہیں معلوم ہو جائے کہ امام کی مدد کے بغیر کوئی تاویل بیان نہیں کر سکتا۔ اسکی مدد بھی انوکھی قسم کی ہے۔

دُوسرے بہت سے دلائل کیساتھ اِس آیت میں بھی امامِ زمان کے پاس علمُ القرآن موجود ہونے کی دلیل ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۱۳:۴۳)۔ ترجمہ: "اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تُو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کیلئے کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے"۔ آنحضرتؐ کی رسالت کے گواہ اللہ اور مولانا علیؑ کے سِوا اور کوئی نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں کس قسم کی گواہی ہے۔ کیا یہ بھی دنیاوی گواہی کی طرح ہے یا اور کچھ! اگر گواہی کی ضرورت ہوئی تو ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہئے۔ یعنی حضرت محمد صلعم کی رسالت سے کافر لوگ محض لفظی انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی عقل کیمطابق دلیلیں بھی پیش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر اب کوئی شخص سائنس اور ایٹمی دلیل سے قرآنِ شریف اور رسالتِ محمدؐ کو باطل کرنے کیلئے کوشش کرے تو گواہ کا کیا کام ہونا چاہئے؟ اللہ جلَّ جلالُہٗ تو پاک ہے، وہ گواہی دینے سے بالاتر ہے۔ اس لئے وہ دنیا میں ظہور نہیں فرمائے گا۔ مولانا علیؑ اور پاک محمدؐ بھی ظاہراً رحلت کر گئے، اب یہ گواہی چند روزہ تھی یا دائمی؟

دیکھئے! جس طرح یہ تمام سوالات اسی آیت سے پیدا ہوئے ہیں اسی طرح ان کے جوابات بھی اسی میں موجود ہیں۔ اللہ اور رسولؐ کے ذکر ہوتے ہوئے مولانا علیؑ کیطرف علم کی نسبت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صرف مولانا علیؑ ہی رسولؐ اور لوگوں کے درمیان گواہ ہے، اور یہ نہیں ہوسکتا کہ خدائے دانا و بینا یا رسولِ پاکؐ مولانا علیؑ سے کچھ کم علم رکھتے تھے، اس لئے مولانا علیؑ کو عالمُ الکتاب کہا گیا ہو اور یہ گواہی بھی کوئی عام گواہی نہیں تھی بلکہ یہود و نصاریٰ وغیرہ عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ قسم قسم کے سوالات لیکر آتے تھے اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت محمدؐ کی رسالت میں کوئی شک پیدا کرسکیں۔ کس کی مجال تھی کہ امیرالمومنین کے ہوتے ہوئے رسالت کی تکذیب کرسکے۔ حضرت مولانا مرتضیٰ علیؑ ہر ایسے شخص کے سوالوں کا جواب دیتے۔ تواریخ سے اس قسم کے مفصل حالات پڑھئے۔ اللہ اور رسولؐ کیطرف سے مولانا مرتضیٰ علیؑ ہی گواہ تھے اور ہر زمانہ میں اسطرح ہوا۔ علمُ الکتاب ظاہر میں یہی قرآنِ شریف ہے۔ اور اس آیت کے مطابق صرف امامِ زمان اس زمانے میں بلاشک مولانا مرتضیٰ علیؑ ہیں۔ جو علمُ الکتاب کے مالک ہیں۔ اور اس آیت کی قطعی دلیل یہ ہے کہ رسولؐ اور اُمّت کے درمیان میں امامِ زمان کی چند خصوصیات ہیں۔ **اوّل**: خدا اور اپنی طرف سے رسولؐ اور خلق کے درمیان میں گواہ۔ **دُوم**: جملہ انسانوں سے دانا۔ کیونکہ دانائی کی وجہ بھی تھی۔ جو گواہ کے لائق ہوا اور دوسرا کوئی نہ ہوسکا۔ **سوم**: ہمیشہ دنیا میں زندہ رہنے والا۔ کیونکہ یہ گواہی دنیا میں قیامت تک رہے گی۔ **چہارم**: قرآنِ شریف کی ساری اصلیّت جاننے والا۔ **پنجم**: قرآن سے دین روشن کرنے والا کیونکہ گواہ اس لئے ہوا ہے کہ دشمنوں کے شر سے اسلام کو محفوظ رکھے اور دین روشن کرے۔

نیز اس آیت میں بالکل واضح ہے کہ قرآن کی ذمّہ داری خدا و رسولؐ کی

طرف سے صرف امامِ زمان کے علاوہ اور کسی کو نہیں پہنچتی اور یہی فیصلہ خدا و رسولؐ کا ہے۔

آیتِ مطلوبہ کی لغات

"واو" یہاں حرفِ عطف کے علاوہ قسم اور ربّ کیلئے بھی آیا ہے۔ "کُلَّ": کل کا لفظ تین قسم کا ہے، تنوین کے ساتھ کلاً، کِلٍ، کلٌ (سب) کلَ، کلِ، کلُ، (سب کے سب) الکل (سبھوں کا سب)۔ "شَیْءٌ": شے وہ ہے جسکا کچھ علم اور خبر ممکن ہو اور وہ عقل میں آسکے، روحانی اور جسمانی میں سے۔ "اَحْصَیْنَاہُ": بروزنِ اخفیناہ۔ اس کا اصل حصی بروزنِ خفی ہے۔ حصی کے معنوں میں سے (۱) گھیرنا (۲) گننا اور ضبط کرنا (۳) کنکر مارنا (۴) کنکر (۵) قیمتی پتھر یعنی گوہر (۶) عدد رائی عقل (۷) وافر العقل (۸) ختم کرنا (۹) نہ بھولنا، یاد رکھنا (۱۰) لکھنا (۱۱) مکمل کرنا (۱۲) قرار کرنا (۱۳) علم کے حصار میں لانا وغیرہ۔ "مُبِیْنٍ": بیان کرنے والا، بولنے والا، آشکار، ظاہر، ترجمان اور دو چیزوں کے درمیان کام کرنے والا۔ (لوح التّاویل)۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ لفظ حصی قرآنِ کریم میں اکثر احاطہ اور عدد سے اوپر کے معنوں کیلئے مستعمل ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۷۲: ۲۶-۲۸)۔

تنزیل: غیب کا جاننے والا۔ پس نہیں ظاہر کرتا اپنے غیب کسی کو۔ لیکن کسی رسول میں سے جو پسند ہو۔ پس وہ چلاتا ہے اسکے آگے اور پیچھے چوکیدار۔ تاکہ جانے کہ انہوں نے اپنے ربّ کے پیغامات پہنچا دئے ہیں۔ اور احاطہ میں لایا جو کچھ ان کے

پاس تھا۔ اور ہر چیز کو عدد میں گھیر لیا۔

تأویل: غیب بمعنی پوشیدہ اور دُور۔ خدا کیلئے نہ کوئی شے پوشیدہ ہے نہ دُور۔ اسلئے لفظِ غیب مخلوقات کی نسبت سے مقرر کردہ لفظ ہے۔ اب سُنیے! آسمان والوں کیلئے زمین دُور اور پوشیدہ۔ زمین والوں کیلئے آسمان غیب اور دُور۔ مشرق کیلئے مغرب غیب، مغرب کیلئے مشرق ناپدید۔ شمال سے جنوب دُور۔ جنوب سے شمال پوشیدہ، انسان، جاندار، نباتات اور عالم کے کُل ذرّات ایک دوسرے کے حق میں غیب ہیں۔ عالمِ روحانی دنیا سے پنہان اور مُردوں سے دنیا پوشیدہ۔ پھر غیب کیلئے کوئی حد مقرّر نہیں۔ جسے حقیقی طور پر غیب کہا جائے۔ پھر غیب یہی عالم ہے، کیونکہ پوشیدگی اور دُوری کا نام ہی غیب ہے۔ پوشیدگی حجاب کا اور دُوری مسافت کا نام ہے۔ حجاب اور مسافت جسم ہے۔ جان و عقل میں نہ حجاب ہے نہ مسافت۔ اس لئے فرماتا ہے کہ عالم کا جاننے والا ہے اور اسکی سطح پر جو عالمِ علوی ہے کسی کو نہیں چڑھاتا۔ مگر جو شخص رُسل سے پسند کیا گیا ہو۔ یعنی حضرت مولانا علی مرتضیٰ لذکرہِ السّجود والتسبیح قائم کے درجے ہیں۔ پھر یہ قائم اپنے آگے اور پیچھے کے اشخاصِ امامت کو رشتۂ نورُاللہ میں پروتا ہے جو کہ وہ امامانِ ناظرانِ رُسل یعنی گواہ ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے ربّ کے پیغامات یعنی قائم کی خبریں پہنچادی ہیں اور قائم نے اپنی لپیٹ میں لیا جو کچھ ان کے پاس تھا اور ہر چیز کو گنتی میں گھیر لیا۔ یعنی بحالِ روحانی اور ھیولیٰ کے بغیر اس نے کُل عالم یا کہ جسمِ کُل کی صورتِ لطیف کو عالمِ بالا میں پہنچایا۔ اس جہان کا اُٹھ جانا یہی ہے۔ اس میں جو بات سوال طلب ہے وہ یہ ہے کہ عالمِ بالا جانا مومنوں کو از خود نہیں بلکہ امام یا حُدود کی نسبت سے ہے۔ پورے دَور کے انبیاء و امامان کے فعل قائم کی طرف سے منسوب ہونے کی وجہ سے اور عالمِ بالا میں ماضی اور مستقبل نہ ہونے کہ وجہ سے حضرت قائم علیہ السّلام اپنے سے آگے اور پیچھے کے سلسلۂ امامت

کو بارِ رشتۂ نورِ الٰہی پیغمبروں کے دلوں میں پروتا ہے، کیونکہ حقیقی نظارت دل ہی میں ہوتی ہے۔

اس تاویلی ثبوت سے یہ مطلب روشن ہوا کہ بڑے دَور کے آخری فعل کا نام "حصی" ہے اور وہ حضرت قائم کا فعل ہے جو کہ سارے حالات، واقعات اور کُلی تواریخِ کائنات اور تمام علوم وفنون ونقوشِ مخلوقاتِ ارض وسماء کو گھیرتا اور ان کو ہیولیٰ سے مجرّد کرتا ہے۔ اس کا دوسرا لفظ "کُن" ہے۔ لطیف سے کثیف بنانے کو "خلق" اور کثیف سے لطیف بنانے کو "کُن" کہتے ہیں۔ خلق میں وقت لگتا ہے اور "کُن" میں کوئی وقت نہیں۔

تاویل: وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۱۲)۔ ترجمہ: "اور ہر ایک چیز کو ہم نے امامِ ظاہر میں گھیر رکھی ہے"۔ یعنی (۱) روحانی صورت میں تمام چیزوں کو جمع کی گئی ہیں۔ گھیرنے میں یہ معنی پوشیدہ ہوتے ہیں: کسی چیز کو کہیں نہ جانے دینا، محدود کرنا، منتشر چیزوں کی یکجائی، انکو ضبط اور قابُو میں رکھنا، چیزوں کی باہمی نزدیکی وغیرہ۔ (۲) ہم نے کُل ارواح وعقول کو اس امامِ ظاہر میں محصُور (گھیرنا) کر دیئے ہیں جو ان کے زمانے کا ہو۔ یعنی امامِ مبینٍ تنوین کے ساتھ آنے سے اماموں میں سے ایک امام مُراد ہے۔ روحانیت میں جو چیز ہو وہ عقل اور روح کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اس لئے چیزوں سے مراد ارواح وعقول ہیں۔ اگر بیانِ مذکور کی بناء پر یہ سوال اٹھایا جائے کہ آپ نے لفظِ احصٰی میں کُل عالم کے نقوش موجود ہونے کا اثبات کیا تھا۔ اب وہ عقل وجان کیسے ہو سکتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر فی المثل روحانیت میں پتھر کا نقشہ ہو تو اس میں بھی عقل وجان ہوتی ہے۔ (۳) ہم نے ہر چیز کو علم البیان والے امام میں تاویل سکھائی ہے کنکر مارنا تاویل میں مسئلہ دینے کو کہتے ہیں اور مُبین کے معنی بیان کرنے والا ہے۔ (۴) ہم نے ہر ایک چیز کو جو وہ غرض تھی امامِ گوینده میں جو ہر

بنایا ہے۔کنکر کی حقیقت لعل، یاقوت وغیرہ ہے جسے جوہر کہتے ہیں۔(۵) ہم نے جمیع علوم و معارف کو گوہرِ عقل میں سمو دیئے ہیں جو کہ امامِ زمان کے پاس ہیں۔(۶) ہم نے دونوں جہان کی جُملہ اشیاء کو بلا مکان دونوں کے درمیان والے امام میں جمع کئے ہیں۔کُلَّ شَیۡءٍ سے دونوں جہان کی چیزیں مراد ہیں۔مُبین بروزنِ مقیم اور بین سے مشتق درمیان میں رہنے والا ہے۔(۷) اور ہر چیز کے کُل کو ہم نے امامِ ظاہر میں گوہر بنایا ہے۔(۸) اور دونوں جہان کی ساری چیزوں کو ہم نے امامِ گویا میں مجتمع کر دیا ہے۔

غرضیکہ لطائف میں سے کوئی ایسی لطیف شے نہیں جو امامِ زمان کی ذاتِ عالی صفات میں موجود نہ ہو۔اسلئے مذکورہ آیتِ شریفہ کی تشریح میں کوئی شُبہ کی گنجائش ہی نہیں۔اس تاویل کی صداقت کی ساری دلیلیں موجود ہیں۔مذکورہ دلائل پر مزید ایک اور دلیل یہ ہے کہ اگر عقل کو بغیر جسم کے دنیا میں موجود ہونا ممکن ہوتا تو وہ بغیر جسم کے ضرور موجود ہوتی۔کیونکہ اگر کوئی شخص اپنا کام خود اچھی طرح سے اور مکمل طور پر کرسکتا ہو تو وہ کبھی دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا۔جزوی عقول سے انکے کُل کے متعلق کچھ علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر عالمِ مجرّدِ عقول میں ان کی تکمیل کی ساری چیزیں ممکن ہوتیں تو انکا یہاں آنا فضول ہوتا۔معلوم ہوا کہ عقل کی تکمیل کا طریقہ احسن یہی ہے جو اَب ہے: فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا (۳۰:۳۰)۔ترجمہ: "اللہ کا پیدا کرنا وہی ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔" یعنی پہلے کی خلقت بھی بالکل اسی طرح ہوئی تھی جس طرح تمہارے زمانے میں ہوتی ہے (اس آیت کی تاویل میں علمِ توحید کا ایک بے پایان خزانہ چُھپا ہوا ہے۔اس لئے جن بزرگوں کو اس علم سے واسطہ ہو وہ اس سے فائدہ اٹھائیں)۔

جب یہ ثابت ہوا کہ جزوی عقل کا تعلق انسانِ ناقص کے ساتھ ہے اور وہ صرف جسم میں عقلِ جزوی کہلانے کی حقدار ہوتی ہے تو پھر درست ہوا کہ کُلی عقل کا

تعلق انسانِ کامل کے ساتھ ہے۔ روحِ جزوی اور روحِ کُلّی بھی اسی طرح ہیں۔ پھر یہ دلیل روشن ہے کہ انسانِ کامل میں روحِ کامل اور عقلِ کامل موجود ہیں، اور ان تینوں چیزوں کے اتحاد، انحصار اور احاطے سے کوئی شے باہر نہیں۔ میں نے روحانی اور جسمانی کُل کے متعلق سمجھانے کیلئے اسی کتاب میں لکھا ہے۔

مثال: سمندر سے دُور اُفتادہ پانی کی مختلف شاخیں سمندر کے اجزاء ہیں اور سمندر ان تمام شاخوں کا کُل ہے یعنی علی التّرتیب ہَوا کی رطوبت، بادل، بارش یا برف، پہاڑوں کی دائمی یخ اور وہ پانی جو کسی صورت میں زمین میں داخل ہو کر پھر چشموں کی شکل میں نکلتا ہے یا میدانی علاقوں میں کنویں (کھوہ) کی صورت میں نکالا جاتا ہے، ندی، نالے، نہریں اور وہ رطوبت جو نباتات میں ہے، اگرچہ چھوٹی سے چھوٹی چیزیں بھی کیوں نہ ہوں، اور جملہ حیوانات کی تری خواہ کوئی کسقدر بھی چھوٹا ذی حیات کیوں نہ ہو یہ سب سمندر کے اجزاء ہیں اور سمندر ان کا کُل ہے۔

ہَوا جسکی طبیعت گرمی اور تری ہے، کرّۂ اثیر (آگ کا کرّہ) سے گرمی اور سمندر سے تری ہر وقت حاصل کرتی ہے، اسلئے ہَوا کو مثال کے طور پر آگ کا جسم اور سمندر کی روح مان لو، کیونکہ لطافت اور ترکیب کی دلیل سے یہ مثال درست ہے۔ اب گوشِ ہوش سے سنئے کہ سمندر اگرچہ بظاہر اپنے اجزاء سے دُور اور علیٰحدہ ہے، لیکن درحقیقت اپنے اجزاء پر محیط ہے۔ آپکو تعجّب نہ ہو، میں دلائل سے ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ سمندر اپنے اجزاء پر کس طرح محیط ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ بیان کے مطابق سمندر سے دُور پانی کا کوئی چھوٹے سے بھی چھوٹا قطرہ ایسا نہیں جو ابتدا میں سمندر سے جدا ہو کر آیا ہوَا نہ ہو، اور وہیں پر از خود یا اور کسی وجہ سے پیدا ہوَا ہو، بلکہ مذکورہ تمام شاخیں پہلے سمندر سے ملی ہوئی تھیں، اسلئے جس چیز کا نام سمندر ہے وہ ان پر محیط (گھیرے ہوئے) تھا اور خشکی

کا تمام پانی اپنے "کُل" کی وجہ سے خشکی پر آسکا، اور یہاں آکر کچھ پانی دوسرے عناصر (مٹی، ہَوا، آگ) کی معیّت میں نباتات، جانور اور انسان کی شکل میں نمودار ہوَا۔ اگر یہ پانی بطریقِ وہم کسی ایسی چٹان میں ہوتا جو کسی پہاڑ یا زمین کے نیچے ہونے کی وجہ سے ہزاروں برس گھستا مِٹتا نہ ہو اور اس چٹان سے پانی نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو، تو ہرگز وہ پانی نہیں نکل سکتا، اور نہ اس کی کوئی قدر و قیمت ہوسکتی ہے، جس طرح نباتات، جانور اور انسان کے جسم بنانے میں ہوتی ہے، اسی طرح جَوہڑ اور تالاب پر سوچیئے! گرمیوں میں چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد جَوہڑ اور تالاب کے پانی کا وجود اپنے حق میں ختم ہو جاتا ہے، یعنی بتدریج بخارات کی شکل میں ہَوا سے مل جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کیوں ختم ہوَا؟ اس لئے ختم ہوَا کہ جَوہڑ اور تالاب کے پانی تک ان کے "کُل" یعنی سمندر سے کوئی سلسلۂ فیض لگا ہوَا نہیں تھا۔ اس کا مطلب عیان ہے کہ اگر کسی ندی، نالے یا بارش وغیرہ سے کچھ پانی مسلسل یا وقتاً فوقتاً جَوہڑ اور تالاب میں گرتا رہتا تو کبھی یہ دونوں ختم نہ ہوتے۔ پھر معلوم ہوَا کہ خشکی کے تمام پانی سمندر کے اجزاء ہیں، کیونکہ یہ سمندر سے آتے ہیں اور وہاں جانے والے ہیں، اور سمندر کے بغیر یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ بحکمِ حدیثِ شریف: کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ۔ یعنی "ہر چیز اپنی اصل (جڑ، بنیاد، اساس، کان اور کُل) کی طرف واپس جاتی ہے۔" تو اس چیز کی اصل یا کُل اس چیز پر محیط ہے، کیونکہ یہ اپنے کُل کے دوامی عمل کے گھیرے میں ہے، مثلاً کسی بڑے دریا کو لے لیجئے جو سمندر سے دُور بہتا ہو، دریا بہتا ہے اسلئے کہ اس کے اوپر کی طرف سے سمندر اپنے عمل سے دھکیلتا رہتا ہے، یعنی اگر سمندر سے بارش نہ ہو تو دریا کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے گا۔

دوسری دلیل: ہَوا جو سمندر کے حق میں روح کی مانند ہے اور سمندر کو اسکے سارے عمل میں مدد دیتا ہے اور سمندر ہَوا کو مدد دیتا ہے، یعنی ہَوا کی تری سمندر

سے ہر وقت ملتی ہے تو پھر یہ ہَوا جو بلاشک سمندر کی روح کی حیثیت سے ہے، اس لئے سمندر کا عمل بشرکتِ ہَوا اپنے اجزاء پر محیط ہے۔

ان دلیلوں سے ثابت ہوَا کہ جسمانی طور پر بھی کسی چیز کے گھیرے جانے کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً کسی مختار بادشاہ یا کوئی دانا صدر کی مثال سمجھئے کہ اس نے اپنی تدبیر سے اپنے ملک کو کس طرح گھیرا ہے۔ حقیقت میں وہ حاکم یا صدر اپنی حکمتِ عملی سے اپنے ملک کے گرداگرد آنے کے علاوہ اپنے ملک والوں کے دلوں میں بھی ایک وجہ سے موجود ہے، اور وہ وجہ یہ کہ لوگوں کے دلوں میں یا تو اپنے حاکم کی طرف سے خوشی ہوتی ہے یا ناراضگی۔ پھر یہ خوشی یا ناراضگی اور کچھ نہیں صرف اس شخص کے اثرات ہیں معلوم ہوَا کہ ایک ایسی چیز بھی ہے کہ اس سے دوسری بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اور وہ کم یا زیادہ نہیں ہوتا ہے، اور یہ صرف روحانی ہے۔ مقصودِ سخن یہ ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ پر ہوتی ہوئی دوسری بہت سی اشیاء پر محیط ہونے کی مثالیں جسمانی طور پر بھی موجود ہیں۔ پھر روح تو اپنی خصوصیات کی وجہ سے جسم سے بہت بالا ہے، لیکن جس طرح دنیاوی چیزوں کو ان کے "کُل" گھیرتے ہیں، یعنی خاکی ذرّات پر ان کا کُل یعنی کرّۂ زمین محیط ہے، آبی ذرّات پر سمندر محیط ہے، بادی ذرّات پر کرّۂ ہَوا محیط ہے، آتشی ذرّات پر کرّۂ اثیر محیط ہے، اسی طرح فلکِ قمر اپنے اجزاء کا "کُل" اور محیط ہے۔ بالکل اسی طرح ہر آسمان اپنے اجزاء کا "کُل" اور محیط ہے، اور اخیر میں فلکِ نہم سارے آسمانوں اور عناصر پر محیط ہے۔ نیچے سے اوپر تک یعنی فلکِ نہم تک اوپر کا کرّہ نچلے کرّے پر محیط ہے۔ فلکِ ہشتم سے کرّۂ خاک تک ہر کرّہ اپنے اوپر کے کرّے میں اسطرح سمویا ہوَا ہے جسطرح پیاز کے پرتیں (پرت = پوست) تہ بہ تہ ہوتے ہیں اور اوپر کا پرت نچلے پر محیط، نچلا پرت اوپر کے پرت میں گھرا ہوَا۔ بالکل اس عالم کی ظاہری شکل اس طرح ہے، لیکن اسکی حرکتوں کا تصوّر دوسرا

ہے جو دائرے میں تیروں کی شکل سے دکھایا گیا ہے۔

نورِ امامت میں عالمِ لطیف مستغرق ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ سُورج اقتضائی حکمت اور عدل کے لحاظ سے اس عالم کے مدارِ اوسط پر واقع ہے یعنی چوتھے آسمان کے قطر کے درمیان میں ہے۔ اس قیاس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنا فاصلہ سورج سے حاشیۂ عالم تک ہو اتنا فاصلہ مرکز تک ہے، تاکہ سورج اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے جسمِ کُل کو برابر روشنی پہنچا سکے۔ اب یہ کہنا ہے کہ اگرچہ سُورج خود تو آسمانوں کے گھیرے میں ہے لیکن اس نے اپنے نور سے سارے عالم کو گھیر لیا ہے۔ چنانچہ رات کے وقت جب آسمان صاف ہو تو بہت سے تارے زمین پر کسی قدر روشنی پھینکتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تاروں سے جو تھوڑی سی روشنی زمین تک پہنچ جاتی ہے کتنے فاصلے سے آتی ہے؟ سنئے! اس روشنی کی مسافت دن کی روشنی کی مسافت کی نسبت تگنی سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے، یعنی سُورج سے آٹھویں آسمان کے تاروں تک اور تاروں سے چوتھے آسمان تک اور وہاں سے زمین تک، یعنی دن کو تو روشنی چوتھے آسمان سے سیدھی آتی ہے اور رات کو سُورج اور تاروں کا دویانی فاصلہ اور تاروں سے چوتھے آسمان تک کا فاصلہ زیادہ ہے، پھر قیاس کریں کہ سُورج کی روشنی کتنی دُور تک پہنچ سکتی ہے۔

اس دلیل سے یقین ہے کہ سُورج کی روشنی اس عالم کی سطح تک پہنچتی ہے اور عالم کو اپنی روشنی میں گھیر لیا ہے۔ اسی مثال سے سمجھ لینا کہ امامِ زمان جو کہ عالمِ دین کے چوتھے آسمان پر جلوہ گر ہے اس سے بھی مکمل اور پورے طور پر عالمِ دین کو گھیر لیا ہے، جس طرح سُورج نے گھیرا ہے، کیونکہ سُورج تو جسم ہے اور جسم بلا حرکت ہر جگہ نہیں پہنچ سکتا، اور امامِ زمان روح ہے یعنی نور، وہ صرف ارادہ سے ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ

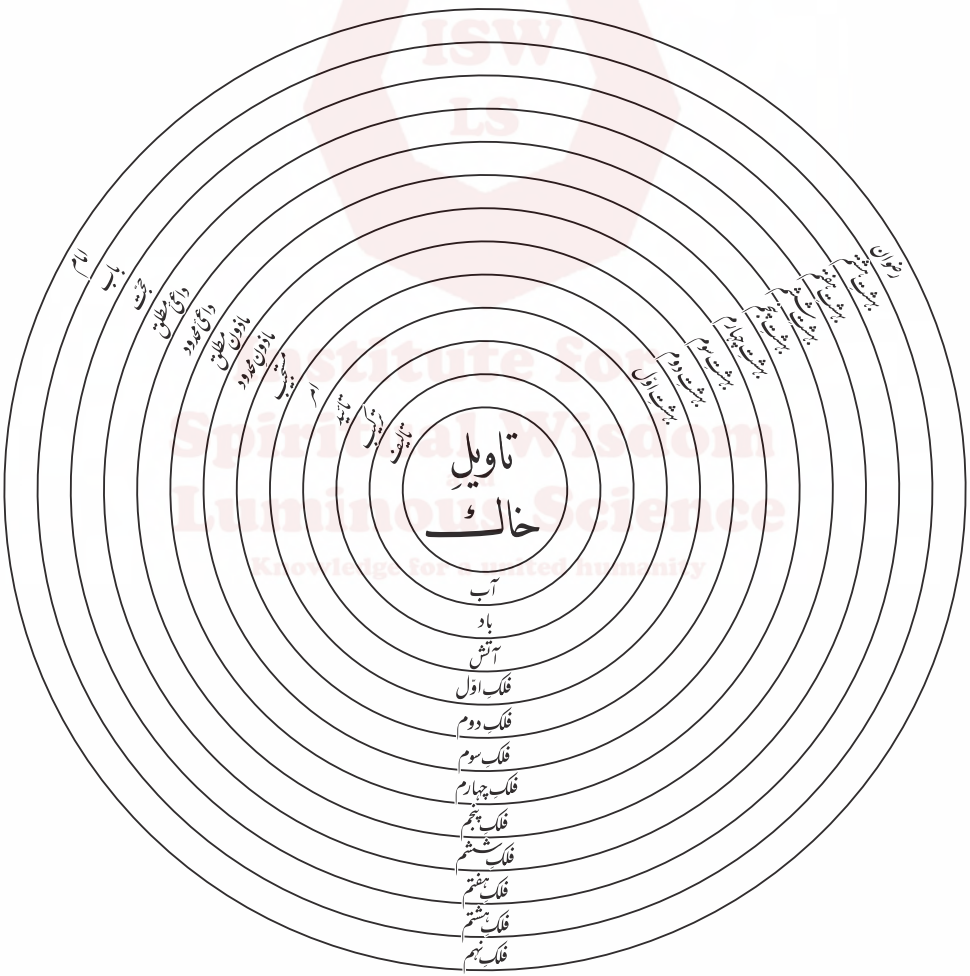

حقیقتِ کُل و جُزو

عالم گیر روح کا نام نفسِ کُل اس لئے رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی نفوس اوّل سے آخر تک اس سے پیدا ہوئے ہیں، چنانچہ جملہ خلائق کے نفوس نفسِ کُل کے اجزاء ہیں، مگر نفسِ کُل کا تصوّر کسی جسمانی کُل کے تصوّر کی طرح نہیں کرسکتے ہیں، چونکہ مادّیاتی اجسام میں متعدد اجزاء ہوتے ہیں، اگر ان میں سے ایک بھی جزو نکال دیا جائے تو یہ کُل کہلانے کے قابل نہیں رہتے ہیں، یا سوائے ایک حصّہ کے تمام حصص اس میں شامل کردئے جائیں تو بھی کُل نہیں کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ایک جزو اس سے علیٰحدہ ہے۔ ایک ہی جزو کی علیٰحدگی کی وجہ سے قانوناً وہ جامع الاجزاءِ کُل کے نام کا حقدار نہیں رہتا ہے۔ جب اس علیٰحدہ شدہ جزو کو اس جامع الاجزاء سے ملا دیا جائے تو اس وقت وہ حدِ کُل تک پہنچ سکتا ہے اور اس کو حقیقتاً کُل کہنا درست ہوگا۔ یہ جسمانی کُل اور اس کے اجزاء کی حقیقت ہے۔

اب روحانی کُل اور اس کے اجزاء کے متعلق اگر ہم غور کریں تو دَورِ حاضرہ کی سائنس سے بہت مثالیں سمجھ سکتے ہیں، جس نے روحانیت کے طلب گاروں کو تعلیمی مثالوں سے مستفیض بنا دیا ہے۔ یہ مثالیں جسمانی ترقی کے تقریباً آخری کرشمے ہیں، لہٰذا جسم کے مدارجِ کمالیّت کی حقیقت پر غور سے تبصرہ کیا جائے تو روح کی توانائی کے درجۂ اوّل کا قیاس کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر اگر ایک اعلیٰ چیز ہمارے سامنے

موجود نہیں، تو ایک ادنیٰ چیز کی سب سے بڑی صفت کی مثال سے اس اعلیٰ چیز کی ایک چھوٹی سی صفت کا اندازہ کرسکتے ہیں، فرض کیجئے ایک آدمی ایک دریا کے کنارے پر بیٹھ کر عالمِ تصوّر میں اس دریا کو بہت ہی عمیق اور وسیع سمجھے تو یہ تصوّر اسکے لئے سمندر کی ایک ادنیٰ مثال پیش کرتا ہے، اگرچہ اس نے سمندر کو نہیں دیکھا ہے، پھر بھی سمندر کے متعلق ایک تصوّر قائم کرسکتا ہے جو کسی حد تک درست ہے۔

علاوہ ازیں جسم اور رُوح کے درمیان کئی متضاد صفات موجود ہیں جن کی وجہ سے روحانی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، فی المثل جسم فانی ہے اور روح باقی ہے، اسی طرح فانی ضد ہے باقی کی، چنانچہ جسم کیلئے مکان و زمان کی ضرورت ہے، روح کیلئے وقت اور جگہ معین نہیں، جسم کیلئے کئی چیزیں رکاوٹ ہوسکتی ہیں لیکن روح کیلئے کوئی چیز حائل نہیں، باوجود این ہمہ اس ایٹمی دَور میں جسمانی اور مادّیاتی ارتقاء کا یہ عالم ہے کہ حضرتِ انسان کیلئے ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک رسائی بھی ممکنات میں سے نظر آتی ہے۔ ہم ہر روز ان عجیب و غریب ایجادات کے مشاہدے کرتے ہیں جن کو جسمانی کمالات کہا جاسکتا ہے، ہزاروں میل دُور سے ہم ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک دوسرے سے بات چیت کرنیکے علاوہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں، اس کے علاوہ ٹیلی فون، ریڈیو، وائرلیس، دُوربین، محرّک تصویریں یعنی فلمیں جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود ہمارے لئے اسقدر معمولی اور سادہ نمایاں ہوگئے ہیں کہ ان کو کوئی بھی تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جسم، روح کے مقابلے میں کوئی قوّت نہیں رکھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جسم روح کے مقابلے میں بالکل بے جان اور جامد ہے، اس کے باوجود روح کی وساطت سے مافوق الفطرت امور سرانجام دے سکتا ہے۔ ہزاروں میل کی مسافت لمحوں میں طے کرسکتا ہے، ہزاروں میل دور کی چیزیں دیکھ سکتا ہے،

ہزاروں سال کے حالات کا مطالعہ کرسکتا ہے، آسمان پر چڑھ سکتا ہے، کائنات کو نقطۂ نظر میں سمو سکتا ہے، غرض وہ سب کچھ کرسکتا ہے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور سُنتے ہیں۔ اگر جسم جس کی حیثیت سوائے مشتِ خاک کے کچھ بھی نہیں، اس قدر عجیب و غریب کمالات روح کے تعاون اور امداد سے انجام دے سکتا ہے تو اندازہ لگائیے کہ روح بذاتِ خود کس قدر توانا اور قوی ہوگی۔ اس قیاس کے ساتھ ساتھ آپ نفسِ کُل کا اندازہ لگائیے کہ اس کا جزو اس قدر قادر اور قوی ہو تو کُل کا اندازہ کس طرح کرسکیں اور اس کی لامحدود قوتوں کا تصوّر کیونکر کرسکیں۔

سینما کے پردۂ سیمین پر آپ کو وہ سب محرّک تصویریں نظر آتی ہیں جن کو آپ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر تنقید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان تصاویر اور صاحبِ تصاویر میں کوئی پیوستگی نہیں، سوائے اس کے کہ صاحبِ تصاویر یعنی ایکٹر کی تصویر لی گئی ہے نہ تصویر لینے سے صاحبِ تصویر میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ ہزار سال پہلے مَرے ہوئے ایک شخص کی تصویر بھی فلم کے پردہ پر تماشائیوں کیلئے زندہ انسان کی طرح باعثِ تفریح ہوسکتی ہے، اگر صاحبِ تصویر میں کوئی ایسی حکمت ہوتی کہ بجائے تصویر نکلوانے کے خود ہی تصویر بن جاتا تو وہ شخص قیودِ جسم سے آزاد ہو کر تصویرِ لطیف بن جاتا، اور اس کی زندگی جسم سے آزاد ہو کر جسمِ لطیف تیار کرلیتی۔

اس جسمانی مثال سے ایک ایسے کُل کا تصوّر ہوسکتا ہے جس کی تکمیل اجزاء سے ہوئی، اور وہ بے نیاز ہوا لیکن اگر اس محسوسی مثال کی مدد سے ایک اور فرضی مثال کا تصوّر کریں تو وہ روحانی کُل کے بالکل قریب ہوگی، یعنی آپ یہ فرض کریں کہ فلمی دنیا ایک روحانی کُل ہے اور تصویروں کے مطابق تصویر والوں کو پیدا کیا گیا ہے، نہ کہ ان سے تصویریں لی گئی ہیں، یعنی ان سے ان کی تصویریں پہلے موجود تھیں اور یہی روح کی حقیقت ہے۔

حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ: خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَۃِ الرَّحْمٰنِ۔ یعنی "اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانیت کی تصویر کے مطابق پیدا کیا ہے۔" مولائے روم جو کاشفِ اسرارِ الٰہی تھے، اس موضوع پر یوں فرماتے ہیں:

ع تن چو سایہ بر زمین و جانِ پاکِ عاشقان

در بہشتِ عدن تجری تحتہا الانہار مست

یعنی عاشقانِ الٰہی کا جسم سایہ کی طرح زمین پر ہے مگر ان کی روح جنتُ العَدن میں مست ہے، جہاں نہریں رواں ہیں یعنی شہد، شراب، دودھ اور پانی کی چار نہریں رواں ہیں۔ قرآنِ مجید کی اس آیتِ کریمہ میں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵:۲۱)۔ "یعنی کوئی بھی چیز نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور اس چیز کو ہم عالم میں گنجائش کی مقدار پر نازل کرتے ہیں۔" معلوم اس عالم کا نام ہے اور بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ سے مراد عالم کی گنجائش ہے۔ معلوم ہوا کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اللہ کے پاس بشکلِ روحانی موجود ہے۔ ہمارا یہ مضمون مثال درمثال ہو رہا ہے، اس لئے پھر ایک بار روحانی جزو و کُل اور بہشت کی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کریں۔

ہمارا یقین ہے کہ قرآنِ شریف میں جہاں کہیں لفظ "کُل" آیا ہو وہاں ضرور کُل کے متعلق معلومات موجود ہیں، لہٰذا اس آیۂ حکمت آگین پر چشمِ بصیرت سے تبصرہ کرتے ہیں: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (۲:۳۱)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے بہترین طریقے پر حضرت آدم کو سارے نام سکھائے اور کوئی ایسا نام نہ رہا جو اسے نہ سکھایا گیا ہو۔ خواہ وہ خالق کے نام ہوں یا مخلوق کے، اور سب سے بہترین طریقہ وہ تھا کہ اللہ نے کُل مسمّیات کو بہشت میں بشکلِ نورانی اور روحانی نعمتوں کی حیثیت سے بتدریج دکھایا، ساتھ ہی ان مسمّیات کے نام، وجہِ تسمیہ، شکل وصورت اور ان کے مظاہرات کی تخلیق

وفنا کی غرض کی ساری حکمتیں سکھائیں۔غرضیکہ کوئی ایسی بات نہ رہی جو علم الاسماء میں نہ آئی ہو۔بزرگانِ دین نے اس بات کی تحقیق کی ہے کہ علم الفاظ میں ہے اور الفاظ اسماء ہیں، پھر اسماء کے مسمّیات ہوتے ہیں، پھر سارے اسماء و مسمّیات اس عالم میں سموئے ہوئے ہیں۔آدمِ حقیقی یعنی عقلِ کُل کو یہی عالم کُلی طور پر نورانی شکل میں دکھایا جا رہا تھا، جس سے کوئی اسم یا مسمّٰی باہر نہ تھا، اور ایک دلیل سے دنیاوی حساب کے مطابق یہ تمام روحانی لذتیں ۹۰۰۰۰۰ (نو لاکھ) برس کے عرصہ میں ایک دفعہ پایان تک پہنچی تھیں۔پھر اس صورت میں ایک تازہ عمل کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لئے اپنا دَوری مظہر دنیا میں بھیجنا چاہتا تھا لیکن کُل روحانی و عقلانی نعمتیں بحالِ خود موجود تھیں اور عقلِ کُل بذاتِ خود نعمتوں سے مستغنی، لیکن اپنے مظہر کی طرف سے نیاز مند تھا۔عقلِ کُل اور نفسِ کُل کے مظاہر یا کہ سائے دنیا میں آدم و حوّا کے نام سے اس طرح آئے جس طرح دوسرے انسان آتے ہیں۔

اس حقیقت کے بیان سے آپ کو یقین ہوگا کہ بہشت بھی کُل میں موجود ہے اور غور سے پڑھا ہوگا کہ عالمِ جسمانی کی نورانی شکل ہی بہشت ہے اور وہی روحانی کُل ہے، وہی آخرت اور وہی عالمِ لطیف ہے۔یہی مطلب بالفاظِ دیگر اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو عالمِ لطیف اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جسکے پڑھنے سے کوئی شک باقی نہیں رہتا۔وَتَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۱۰:۳۷)۔یعنی قرآن میں اس کتاب کی تفصیل ہے، جس میں شک (ضدِ یقین) نہیں، یعنی یقین ہے، اور یقین صرف آنکھوں سے حاصل ہوتا ہے۔اگر طلبِ لذّاتِ روحانی کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بہشت ہے۔وَسَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۵۷:۲۱)۔ترجمہ: "اور ایک دوسرے سے آگے نکلو، اپنے پروردگار کی ایک بخشش اور ایک بہشت کی طرف، جس کی نمود آسمان اور زمین کی نمود کی طرح ہے۔" اگر

روحانیت سے دیکھا جائے تو وہی نفسِ کُل ہے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲:۲۵۵) یعنی "اُس کی کرسی (نفسِ کُل) نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سمویا ہے۔" اگر نظریۂ علم و حکمت سے دیکھا جائے تو وہی عقلِ کُل ہے۔ وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ (۶:۸۰)۔ میرے پروردگار نے ہر چیز کو علم (عقلِ کُل) میں سمو رکھا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ، تو یہی مطلب اور بھی واضح ہوا ہوگا، کہ روحانی کُل سے کوئی شے باہر نہیں، بلکہ جسمانی کُل بھی روحانی کُل میں سمویا ہوا موجود ہے اور وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ اب روحانی کُل کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ درحقیقت قسمت پذیر نہیں، یعنی یہ تقسیم نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روح ایسی نہیں کہ ایک سے دو ہونے میں اس میں کوئی کمی واقع ہو، کیونکہ کمی و بیشی جسم کی صفت ہے، مثلاً عالمِ جسمانی ایک ہے اور اس کی شکلِ نورانی یعنی عالمِ روحانی بھی ایک ہے۔ لیکن اس عالم سے خدائے تعالیٰ ہزاروں نہیں بلکہ لاانتہا عالم نورانیت میں موجود کرسکتا ہے تاکہ اپنے بندوں میں سے ہر ایک کو جداگانہ ایک عالم میں ابدی شاہنشاہیّت عطا کرے، اور یہ بھی اس کی قدرت کیلئے ہمارا اعتراف ہے کہ ایک ہی روح ان بیشمار عالموں میں بیک وقت بہرشکل وصورت موجود ہوسکتی ہے اور یہ سب کُل کے ذریعے سے ہوسکتا ہے۔

چاروں اصل امامِ زمانؑ میں

نبی صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ اور ایک حدیث میں فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ نے میرا نُور پیدا کیا۔ اور یہ تینوں حدیثیں مشہور ہیں۔ لیکن دانا لوگ جانتے ہیں کہ ترتیب میں تینوں چیزیں ایک ہی حالت میں اوّل نہیں ہوسکتی ہیں۔ خواہ وہ تقدّمِ شرفی ہو یا تقدّمِ زمانی ہو۔ حکمائے دین اور بزرگانِ اہلِ تصوّف نے ان تینوں حدیثوں کا خلاصہ ایک بتایا ہے، یعنی عقل، قلم اور نورِ محمّد ایک ہے، اسی طرح رسول اللہؐ کے فرمان کے مطابق نبیؐ اور علیؑ ایک ہی نور ہیں، اور وہ اکیلا نور امامِ زمان ہے، پھر امامِ زمان ہی عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس ہے۔

اس حقیقت کی پہلی دلیل یہی ایک مسمّٰی کے پانچ نام میں موجود ہے، چنانچہ عقلِ کُل اسے کہتے ہیں جو کُل اشیاء پر محیط ہو اور کوئی شے اس سے باہر نہ ہو، کیونکہ اگر عقلِ کُل کے گھیرے سے کوئی چیز باہر بھی ہوتی تو وہ عقلِ کُل کُل نہیں کہلا سکتا، جس طرح ایک جزو کی کمی کی وجہ سے کُل کا نام اُٹھ جانے کی محکم دلیل اسی فصل میں لکھی گئی ہے اور نفسِ کُل اسے کہتے ہیں جو بلحاظِ حیات و جاندہی جملہ اشیاء پر محیط ہو، کیونکہ اگر بفرضِ محال کوئی چیز نفسِ کُل سے باہر ہوتی تو اس صورت میں وہ چیز تین حالتوں میں سے ضرور ایک حالت میں ہوتی، یا وہ شے نفسِ کُل سے کامل تر ہوتی، یا اس کے برابر

یا اس سے ناقص تر اور چوتھی کوئی حالت نہیں۔ پھر ان تینوں حالتوں میں بھی دونوں چیزوں کی وحدت لازم ہوتی، کیونکہ کامل ناقص کو اپنے ساتھ کامل بناتا ہے اور جملہ صفات میں دو برابر چیزیں اگر لطیف اور بغیر حجاب کے ہوں تو فوراً مل جاتی ہیں، لیکن عالمِ امر میں کسی کام کے لئے دیر نہیں لگتی، پھر معلوم ہوا کہ عقلِ کُل و نفسِ کُل کے درمیان میں بحقیقت دوئی نہیں بلکہ ایک چیز کے دو نام ہیں۔

اسی طرح پاک محمدؐ صلعم ہیں۔ چنانچہ خدا کے قول کے مطابق رسولِ پاکؐ کُل عالمین کیلئے خدا کی رحمت تھے۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (۲۱:۱۰۷)۔ عالمین عالم کی جمع یعنی عالمِ جسمانی، عالمِ روحانی، عالمِ عقلانی، دوسرے الفاظ میں کُل اشیاء جو اللہ کے امر سے پیدا ہوئی ہوں، پھر نبی پاکؐ رحمتِ کُل ہوئے اور کُل اشیاء پر ان کا نورِ رحمت محیط ہے، کیونکہ خدا کی رحمت نے سارے جہانوں کو گھیر لیا ہے اور عقل گواہی نہیں دیتی کہ خدا کی رحمت سے بالاتر کوئی چیز ہے، پھر دانش والے اس بات کیلئے ہرگز تسلیم نہیں کر سکیں گے کہ عقلِ کُل اور نفسِ کُل میں رحمت نہیں، اور رحمت میں عقل و حیات نہیں، بلکہ اصلیت یہ ہے کہ عقل و حیات ہی رحمتِ الٰہی ہے اور رحمتِ الٰہی عقل و حیات ہے، پھر دلیل سے معلوم ہوا کہ حضرت محمدؐ ہی اپنے زمانے کے عقلِ کُل اور نفسِ کُل تھے۔

اب رہا اساس کی شناخت، اساس کہتے ہیں بنیاد کو، وہ حقیقت میں کُل کائنات و موجودات کی اوّلین بنیاد تھا، جس کے بغیر کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی، وہ ساری چیزوں کا آغاز تھا، اس کا اسمِ مبارک علیؑ تھا اور خدا نے یہ نام رکھا تھا، چونکہ خدا کا قول سچائی اور عدل میں پورا ہوتا ہے یعنی جس چیز کو بلند کہے وہ واقعی بلند ہوتی ہے اور اس سے دوسری کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی۔ علیؑ کا یہ مبارک اسم جو خدا کے حکم سے رکھا گیا تھا، بلند یعنی اونچائی کے معنی رکھتا ہے۔

بلندی یا برتری دو قسم کی ہوتی ہے، برتریٔ شرفی و برتریٔ مکانی یعنی عزّت کی بلندی اور جگہ کی بلندی، دونوں معنوں سے مولانا علیؑ جملہ اشیاء سے برتر ہے، چونکہ اس کا نورعقلِ کُل، روحِ کُل اور رحمتِ کُل کے ناموں سے کُل عالم پر محیط ہے۔ جب مولانا علیؑ جملہ مخلوقات سے بالاتر ہیں تو اسے بالائے کُل کہنا بالکل درست ہوگا۔ اس قسم کی برتری صرف نام کی نہیں بلکہ اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جن کی وجہ سے برتر کہنا حقیقتاً درست ہوسکتا ہے یعنی اس برتری میں بھی تمام چیزیں سموئی ہوئی ہیں، جس طرح عقل، روح اور رحمت میں سموسکتی ہے گویا مولانا علیؑ عقلِ کُل، نفسِ کُل اور رحمت کُل ہیں۔

اسی طرح امامِ زمان ہے جس کا نور وہی نور ہے جو محمدؐ اور علیؑ میں تھا۔ مذکورہ بالا تمام صفات امامِ زمان کے نور میں ہر وقت موجود ہیں۔ لفظِ امام اُمّ کے مصدر سے مشتق ہے، اس لئے اِمام القوم اور اُمُّ القوم دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی قوم کا سردار یا قوم کا امام۔ بعض دفعہ یہی لفظ اُمّ جو امام کے معنی میں آتا ہے، اُمَّۃٌ (امام) سے بدل جاتا ہے، جس طرح خلیف سے خلیفہ اور ملائک سے مَلائکۃٌ وغیرہ بنتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶: ۱۲۰)۔ حضرت ابراہیمؑ امام تھے، اللہ کی توحید منوانے والے اور وہ موحدوں کے سردار تھے۔

اس قدر تشریح کے بعد لفظِ اُمّ اور امام کی اصلیّت کو دیکھیں گے۔ لفظِ اُمّ یا کہ امام کے معنی ہر چیز کی اصل ہوئی، یعنی وہ چیز جو سب سے اوّل ہو، جس سے بہت سی چیزیں پیدا ہوئی ہوں، مثلاً اُمُّ الکِتَاب کُل کتابوں کی اصل، ہر زمانے اور ہر دَور کی آسمانی کتابوں کا موجد، وہ اصل اور وہ موجد امامِ زمان کا نُور ہے۔ یقین ہو کہ دلیلاً امامِ زمان ہر آسمانی کتاب کی اور ہر چیز کی اصل ہے اور یہ وہ اصل ہے جس سے کوئی شے مقدّم نہیں، پس اُمُّ الکِتَاب یعنی امامِ زمان ہی عقل، روح، رحمت اور برتر ہے یعنی

عقلِ کُل نفسِ کُل، ناطق اور اساس کا واحد نُور امامِ زمان کا نور ہے۔ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵:۷۹)۔ یعنی عقلِ کُل اور نفسِ کُل دونوں امامِ مبین سے کام کرتے ہیں۔ مولائے روم فرماتے ہیں:

ع عقلِ کُل و نفسِ کُل مردِ خدا است
عرش و کرسی را مدان کز وی جُدا است

ترجمہ: عقلِ کُل اور نفسِ کُل شخصِ واحد ہے۔ یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ عرش و کرسی اس سے جُدا ہیں۔

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

تطابق دَورِ مہین و دَورِ کہین و ایّامِ ہفتہ

قولہٗ تعالیٰ :

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ (۷۰:۴)۔ وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (۲۲:۴۷)۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ (۱۵:۸۷)۔ وَذَکِّرۡہُمۡ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ (۱۴:۵)۔

ترجمہ : فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے (۷۰:۴)۔ اور ایک دن تیرے ربّ کے پاس ایک ہزار برس کی طرح ہے جو تم گنتے ہو (۲۲:۴۷)۔ اور ہم نے تجھے سات سات اور قرآنِ عظیم دیا ہے (۱۵:۸۷)۔ اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا۔ اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے اور شکر کرنے والے کیلئے (۱۴:۵)۔

۴۹ + قرآن العظیم (محتجب) = ۵۰ × ۱۰۰۰ = ۵۰۰۰۰

۷ + ۷ = ۱۴ = ہفت امام و ہفت حجّت از فرزندانِ ایشان، بطریقِ وحدت ہفت ہفت اشخاصِ امامت ۷ × ۷ = ۴۹ اشخاصِ امامت پس از پیغمبر علیہ السّلام۔

وحدت هر هفتی

از اشخاصِ امامت چون هفتهٔ دین و دنیا

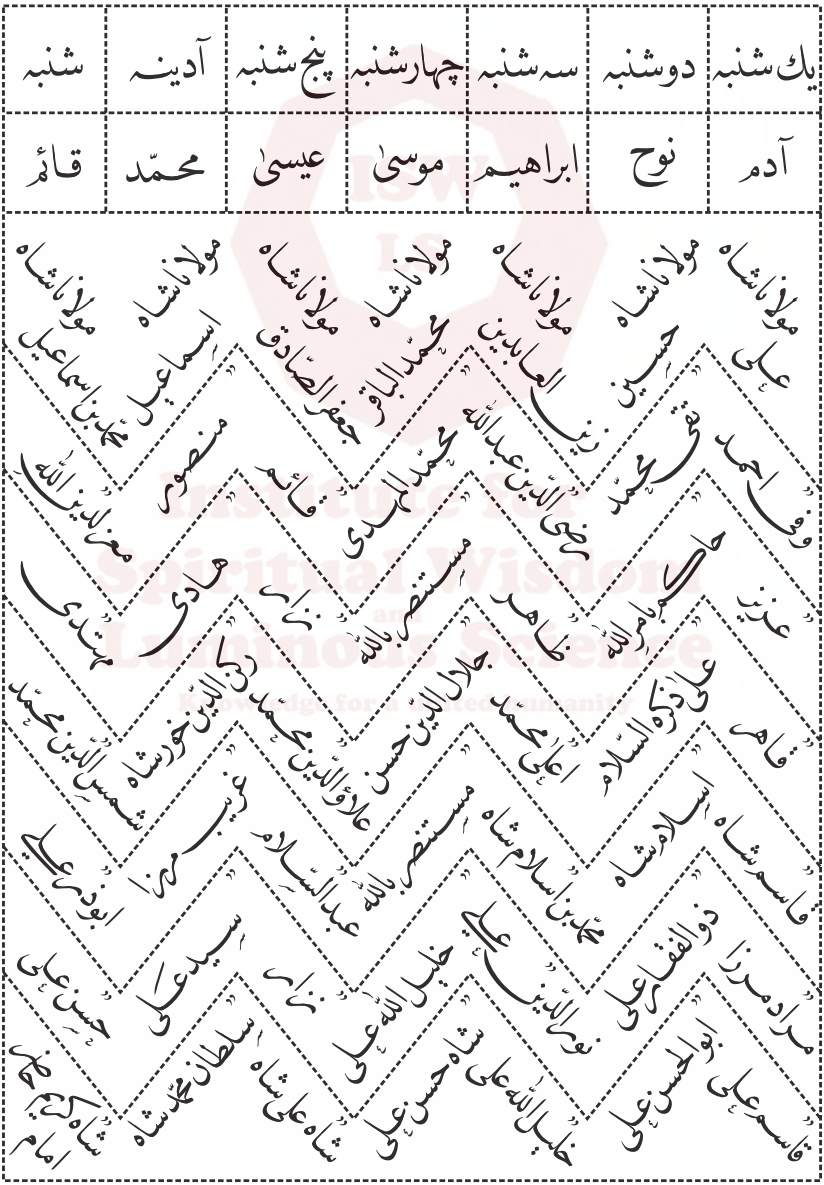

خراجِ عقیدت از اسماعیلیۂ چین

(دوستِ مُصطفٰیؐ)

انبیاء لرکہ شہنشاہ مصطفٰی ننگ یاری کیم ؟
اُول علیؑ المرتضایم مُصطفٰی ننگ یاری دُور

ہر جہاد ننگ لشکریگہ نامدار سرداری کیم؟
ذُوالفقار ننگ ایگاسی مولانا علی سرداری دُور

قیسی نعمت دُور کہ توگوماس لذّتی ہم راحتی!
دلبرِ زیبا علی ننگ رنگ برنگ دیداری دُور

سُوز لاگوچی قرآن علی دُور ہر لباسی دا آشکار
ہر زمان دا ہر مکان دا صاحبِ اسراری دُور

ہم مکان دا لامکان دا عرشی دا ہم فرشی دا
مرتضیٰ دور مرتضیٰ ننگ بوالعجائب کاری دُور

یار ننگ جلوہ عجب دُور ہر زمانِ منگ شکلی دا
عاشقان لر ننگ عجب بِر دلبرِ عیّاری دُور

من گُل و گُلزارِ دُنیا غہ فقط محتاج اماسِ
ہر زمان جان و دلیم دا عشقی ننگ گُلزاری دُور

شاہ ننگ دیدار اُو چُون بس بیقرار دُو رشُول نصیؔر
بیقرار لر ننگ قراری شاہ ننگ دیداری دُور

ترجمہ :

۱۔ شاہنشاہِ انبیاء حضرت محمدؐ مصطفےٰ (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کا دوست کون ہے؟ وہ حضرتِ علیؑ مرتضیٰؑ ہے جو محمدؐ مصطفےٰ کا دوست ہے۔

۲۔ ہر جہاد کے لشکر کا نامور امیر اور سردار کون ہے؟ صاحبِ ذُوالفقار مولانا علیؑ اس لشکر کا سردار ہے۔

۳۔ وہ کونسی نعمت ہے، جس کی لذّت اور راحت کبھی ختم نہیں ہوتی؟ وہ نعمت دلبرِ زیبا علیؑ کے رنگ برنگ دیدار کی صورت میں ہے۔

۴۔ بولنے والا قرآن علیؑ ہے جو کہ ہر (امام کے) لباس میں ظاہر رہا ہے، ہر زمانے میں اور ہر جگہ بھیدوں کا مالک موجود ہے۔

۵۔ مکان ولامکان میں بھی، عرش و فرش پر بھی مرتضیٰ علیؑ ہے، کیونکہ مرتضیٰ علیؑ عجائب و غرائب کا مالک ہے۔

۶۔ جلوۂ جانان بڑا تعجب خیز ہے کہ ہر گھڑی ہزار شکلوں میں بدلتا ہے، عاشقوں کا یہ ایک بہت ہی عجیب چالاک معشوق ہے۔

۷۔ میں دُنیا کے گُل و گلشن کیلئے، ہرگز محتاج نہیں ہوں (کیونکہ) ہر وقت میری جان اور دل میں عشقِ حقیقی کا ایک گُلزار موجود ہے۔

۸۔ (دینی) بادشاہ کے مُبارک دیدار کیلئے یہ نصیر بہت بیقرار ہے، بیقرار عاشقوں کیلئے قرار شاہ کے دیدار میں ہے۔

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

جذبۂ روحیۂ اسماعیلیؑ شرقی ترکستان

(غلامِ علیؑ)

من علی گہ بندہ دُور من شاہِ سُلطانیم علی
طاعتیم حجّیم نمازیم دین وایمانیم علی

کنتُ کنزاً مخفیاً انگلاب خزانہ ایستاسام
باشقہ برکشی تاپمادیم اُول گنجِ پنہانیم علی

دردِ غم دین جیغلامایمن جیغلاسام دیدار اُو چُون
راحتم نوریم شفایم حرزو درمانیم علی

کُوندا یُوزرمنگ مقصدیم تاپتیم علی ننگ فضلی دین
جان پناھیم مہربانیم مشکل آسانیم علی

شُول زمان سُلطان محمّد شاہ علی دُور اُول علی
نورِ یزدانیم علی دُور مغزِ قرآنیم علی

حیدرِ صفدر علی دُور فاتحِ خیبر علی
شاہ دَورانیم علی دُور شاہِ مردانیم علی

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

لَا فَتٰی اِلَّا عَلی لَا سَیفَ اِلَّا ذُو الفَقَار

ہر بلا دین سا قلا غوچی سن اے نگھبانیمِ علی

رمزِ حَبلُ اللہ علی دُوم عُروَۃُ الوُثقٰی علی

مالکِ حور و قصور و خُلد و رضوانیمِ علی

ایکِکی عالم دا سخی سُلطان محمّد شاہ علی

حشر دا قاضی عَلی دُوم شاہِ شاھانیم علی

ترجمہ :

۱۔ میں مولا علیؑ کا بندہ (غلام) ہوں، میرا (حضرت مولانا امام) سُلطان محمّد شاہؑ جنابِ علیؑ ہے، میری عبادت، میرا حجّ، میری نماز، میرا دین وایمان علیؑ ہے۔

۲۔ کُنتُ کنزاً مخفیاً (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا... کی حدیثِ قدسی) سُن کر جب میں نے اُس خزانے کو ڈھونڈا، تو مجھے کوئی دوسرا نہیں ملا بلکہ وہ میرا مخفی خزانہ علیؑ ہے۔

۳۔ میں درد و غم سے نہیں روتا ہوں، اور اگر میں آنسو بہاؤں تو یہ دیدار کے لئے ہے، کیونکہ میری راحت، میرا نور، میری شفاء، میری جائے پناہ اور دوا علیؑ ہے۔

۴۔ مولا علیؑ کی مہربانی سے ہر روز مجھے لاکھ مقاصد حاصل ہوتے رہے، میری جان کی پناہ، میرا مہربان، میرا مشکل کُشا علیؑ ہے۔

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

۵۔ اِس زمانے میں حضرت مولانا امام "سُلطان محمّد شاہؑ" علیؑ ہے وہی علیؑ میرے لئے نورِ خدا علیؑ ہے، اور قرآن کا مغز (باطن) علیؑ ہے۔

۶۔ (لشکرِ دشمن کی) صف کو چیرنے والا شیر علیؑ ہے، خیبر کو فتح کرنے والا علیؑ ہے، زمانے کا بادشاہ علیؑ ہے، اور بہادروں کا سرتاج علیؑ ہے۔

۷۔ علیؑ جیسا کوئی بہادر نہیں، ذوالفقار جیسی کوئی تلوار نہیں، ہر بلا سے بچانے والا تو ہے اے میرا نگہبان علیؑ!

۸۔ حَبْلُ اللّٰہ (خدا کی رسّی) کا اشارہ علیؑ ہے، عُرْوَۃُ الْوُثْقٰی (مضبوط حلقہ) علیؑ ہے، حورانِ بہشتی اور محلّات کا مالک، میری جنّت اور رضوان علیؑ ہے۔

۹۔ دونوں جہاں کا سخی حضرت مولانا سُلطان محمّد شاہؑ ہے، جو زمانے کا علیؑ ہے، اور روزِ قیامت کا قاضی بھی علیؑ ہے۔

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

مُکرمانه هدیهٔ ناچیز را چیزے شمار

ای شهِ دورِ قیامت نورِ مولانا کریم
ماهِ گردونِ امامت نورِ مولانا کریم

بر زمین و آسمان نورِ خدائے ذوالجلال
باعثِ فضل و کرامت نورِ مولانا کریم

دیدهٔ باطن چو بدهی شاهِ ملکِ دل شوند
مملکتها زیرِ گامت نورِ مولانا کریم

ای خوشا! دیوِ جهالت از جهان خواهد گریخت
از نهیبِ دورِ تامت نورِ مولانا کریم

جان من با تو ست این تن سایهٔ آن جان خوش
عالمِ امن و سلامت نورِ مولانا کریم

با هزاران نام یک نوری به هر دوری عیان
در جهان باشد دوامت نورِ مولانا کریم

جامع الاسماست نامت اکرم و مکرم توئی
جان فدا سازم بنامت نورِ مولانا کریم

یافته عاشق زتو گنجِ مرادِ دو جهان
از گهرهائی کلامت نور مولانا کریم

جز وصالِ تو نخواهد این جهان و آن جهان
آنکه شد مخمُورِ جامت نور مولانا کریم

ای سپهرِ عقل و جانِ فیض بخش و نوربار
کم نباشد فیضِ عامت نور مولانا کریم

مرکزِ علمِ حقائق روح مبسوطِ دو کون
دین قائم در نظامت نور مولانا کریم

چشمِ جانِ عاشقان را نورِ تو نورِ نظر
گوشِ هوشِ شان پیامت نور مولانا کریم

عشق دیده صد قیامت از قیامت پیشتر
از تو هر دم صد قیامت نور مولانا کریم

رام نشود توسنِ دوران به شاهان و مهان
خوش تو ران اندر لجامت نور مولانا کریم

جلوه هائی رنگ برنگ بینند در دنیائے دل
از رخِ ماهِ تمامت نور مولانا کریم

مکرمانه هدیهٔ ناچیز را چیزے شمار
از نصیر الدّین غلامت نور مولانا کریم

فہارس

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آیاتِ قرآنی

۲ : ۳۱ ..... ۱۰۰
۲ : ۹۷ ..... ۳۱، ۳۲
۲ : ۱۱۷ ..... ۴۶
۲ : ۱۴۰ ..... ۳
۲ : ۲۲۱ ..... ۵۴
۲ : ۲۵۵ ..... ۲۵، ۱۰۲
۴ : ۸۰ ..... ۵۵
۴ : ۱۴۷ ..... ۱۴
۴ : ۱۶۵ ..... ۴۰
۵ : ۱۵ ..... ۱، ۲، ۶۱
۵ : ۱۶ ..... ۲، ۶۱
۵ : ۳۵ ..... ۳۴
۶ : ۳۶ ..... ۴۳
۶ : ۸۰ ..... ۱۵، ۱۰۲
۶ : ۱۴۹ ..... ۴۰
۷ : ۵۴ ..... ۴۷، ۴۸
۷ : ۶۳ ..... ۵۱
۸ : ۱۷ ..... ۵۵
۹ : ۳۶ ..... ۴۳
۱۰ : ۳۷ ..... ۱۰۱
۱۱ : ۳۷ ..... ۱۶
۱۱ : ۴۰ ..... ۱۶
۱۳ : ۴۳ ..... ۲۰، ۸۶
۱۴ : ۵ ..... ۱۰۷
۱۴ : ۲۴-۲۵ ..... ۲۲
۱۴ : ۳۴ ..... ۸۳، ۸۴
۱۵ : ۱۶، ۱۷ ..... ۳۷
۱۵ : ۲۱ ..... ۱۰۰
۱۵ : ۷۹ ..... ۵۷، ۱۰۶
۱۵ : ۸۷ ..... ۱۰۷
۱۶ : ۱۶ ..... ۵۷
۱۶ : ۱۲۰ ..... ۱۰۵
۱۷ : ۳ ..... ۱۶
۱۷ : ۷۱ ..... ۵۶
۱۷ : ۸۸ ..... ۱۹، ۲۰
۱۸ : ۵۱ ..... ۷۸
۱۸ : ۵۴ ..... ۷۰
۲۱ : ۱۰۷ ..... ۱۰۴
۲۲ : ۴۷ ..... ۴۶، ۱۰۷
۲۳ : ۶۲ ..... ۲۶
۲۴ : ۳۵ ..... ۳، ۴، ۶۷، ۶۸
۲۵ : ۸ ..... ۲۴، ۲۵
۲۸ : ۳۴ ..... ۲۶
۲۸ : ۷۶ ..... ۳
۲۸ : ۸۸ ..... ۵۹، ۶۰
۲۹ : ۶۴ ..... ۴۵
۳۰ : ۳۰ ..... ۹۱
۳۱ : ۱۲ ..... ۱۱
۳۱ : ۲۰ ..... ۳۵، ۳۶
۳۳ : ۲۱ ..... ۳۳
۳۳ : ۴۶ ..... ۴۲
۳۴ : ۲ ..... ۶۱

۳۴ : ۲۶ ..... ۳۱
۳۴ : ۴۵ ..... ۲۷
۳۶ : ۱۲ ..... ۸۲، ۹۰، ۹۶
۳۹ : ۶ ..... ۶۴
۴۰ : ۷ ..... ۶۸
۴۱ : ۴۹ ..... ۸۵
۴۲ : ۱۵ ..... ۴۰
۴۷ : ۲۴ ..... ۸۲
۴۸ : ۱۰ ..... ۵۵
۵۱ : ۷ ..... ۶۱
۵۱ : ۵۶ ..... ۵۴
۵۳ : ۳-۴ ..... ۲۶
۵۷ : ۱-۳ ..... ۱۰
۵۷ : ۳ ..... ۸۰
۵۷ : ۲۱ ..... ۶۹، ۱۰۱، ۱۰۲
۶۷ : ۳ ..... ۲۵
۷۰ : ۴ ..... ۱۰۷
۷۲ : ۳ ..... ۳۰
۷۲ : ۲۶-۲۸ ..... ۸۸
۷۵ : ۸، ۹ ..... ۸۰
۸۱ : ۲ ..... ۸۰
۸۵ : ۲۱، ۲۲ ..... ۲۵
۸۷ : ۶ ..... ۲۸

احادیثِ نبوی

۱۔ اُمِرتُ لِصَلاحِ دُنیاکُم وَنَجاتِ آخِرَتِکُم۔ ..... ص ۵۱

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ اَسَّسَ دِینَہُ عَلیٰ مِثالِ خَلقِہِ... وَبِدِینِہِ عَلیٰ وَحدَانِیَّتِہِ۔ ..... ص ۷۸

۳۔ اِنَّ لِلّٰہِ مِائَۃَ اَلفِ نَبِیٍّ وَاَربَعَۃً وَعِشرِینَ اَلفَ نَبِیٍّ مِنْ وُلدِ آدَمَ اِلیٰ القَائِمِ۔ ..... ص ۳

۴۔ اِنَّ مِنکُم مَنْ یُقَاتِلُ بَعدِیْ ... خَاصِفُ النَّعلِ یَعنِیْ اَمِیرَ المُؤمِنِینَ۔ ..... ص ۲۷

۵۔ اَنَا مَدِینَۃُ العِلمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ ..... صص ۲۸، ۴۱

۶۔ اَنتَ مَعَ الاَنبِیَاءِ سِرًّا وَمَعِیَ جَھرًا۔ ..... ص ۲۶

۷۔ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِترَتِیْ اَھلَ بَیتِیْ۔ ..... ص ۱۸

۸۔ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْعَقْلُ۔ ..... صص ۲۴، ۱۰۳

۹۔ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْقَلَمُ۔ ..... صص ۲۴، ۱۰۳

۱۰۔ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی نُوْرِیْ۔ ..... صص ۲۴، ۵۷، ۱۰۳

۱۱۔ خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَۃِ الرَّحْمٰن۔ ..... ص ۱۰۰

۱۲۔ سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ ... اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ .... ص ۳۰

۱۳۔ کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ۔ ..... ص ۹۳

۱۴۔ اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ وَعَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ۔ ..... ص ۲۸

۱۵۔ لِکُلِّ حَرْفٍ مِنْ حُرُوْفِ الْقُرْاٰنِ حَدٌّ وَّلِکُلِّ حَدٍ مَطْلَعٌ۔ ..... ص ۸۲

۱۶۔ لَوْخَلَتِ الْاَرْضُ مِنْ اِمَامِ الْوَقْتِ سَاعَۃً لَمَادَتْ بِاَھْلِھَا۔ ..... ص ۵۵

۱۷۔ مَامِنْ اٰیَۃٍ مِنْ اٰیَاتِ الْقُرْاٰنِ اِلَّا وَلَھَا ظَھْرٌ وَبَطْنٌ ... اِلٰی سَبْعِیْنَ بَطْنًا۔ ..... ص ۸۲

۱۸۔ مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی اللّٰہَ۔ ..... ص ۵۸

۱۹۔ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً وَالْجَاھِلُ فِی النَّار۔ ..... ص ۵۲

۲۰۔ یَاعَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی۔ ..... ص ۲۶

ارشادات

مولانا مرتضٰی علیؑ

۱۔ اگر میں موت سے مروں تو ہرگز نہیں مرتا۔ اور اگر مجھے قتل کر دیا جائے تو میں ہرگز نہیں قتل ہوتا ہوں۔
(کوکبِ دُرّی، باب سوم، منقبت نمبر ۵۳) .... ص ۲۹

۲۔ اَنَا وَجْہُ اللّٰہِ۔ .... ص ۵۹

متفرّقات

۱۔ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا۔ .... ص ۶۴

اشعار

۱۔ چیزی کہ ستوران و ددان با تو شریک اند :: منّت ننہد با تو بدان ایزد داور ص ۱۴

۲۔ نعمت نبود آنچہ ستوران بخورندش :: نے ملک بود آنچہ بدست آردش قیصر ص ۱۴

۳۔ از دلِ حجّت بحضرت رہ بُود :: او بتائیدِ دلش آگہ بُود ص ۴۲

۴۔ محمّد بود قبلہ گاہِ عالم :: ولی بر تختِ دل سلطان علی بود ص ۷۱

۵۔ حُدود دان چہ نباشی خدائے دان نشوی ص ۸۱

۶۔ تن چو سایہ بر زمین و جانِ پاکِ عاشقان :: در بہشتِ عدن تجری تحتہا الانہار مست ص ۱۰۰

۷۔ عقلِ کُل و نفسِ کُل مردِ خدا است :: عرش و کرسی را مدان کزوی جُدا است ص ۱۰۶

اشاریہ

آ

حضرتِ آدمؑ ..... ۳، ۱۵، ۲۵، ۳۸، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۸

آدمِ حقیقی ..... ۲۴، ۱۰۱

آفاق وانفس ..... ۷۵، ۷۸

آلِ محمدؐ ۸

آیتِ محکم ۸۴

آیتِ متشابہ ۸۴

ا

ابد ..... ۲۳،

ابداع ..... ۴۶، ۴۷،

حضرت ابراہیمؑ ..... ۱۵، ۲۵، ۳۸، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۵، ۱۰۸

ازل ۲۳

حضرت اسرافیلؑ ..... ۲۳، ۳۰، ۳۴

الہام ..... ۷۱، ۷۵

اُم الکتاب ۱۰۵

امامِ اساس ..... ۱۷، ۲۲، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۴، ۴۶، ۶۱، ۸۱، ۸۴، ۸۹، ۹۶، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶

اُمّت محمدیہ ۱۶

امر ۹۶

امرِ باری ..... ۷۶، ۷۷

امرِ کُلّ ..... ۱۷، ۲۱، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۷۲

امرِ کُن ..... ۲۱، ۴۷، ۹۰، ۱۰۴

انجیل ۲

انسانِ کامل ۹۲

اہلِ تصوّف ۱۰۳

اہلِ کتاب ۲

ایٹمی دَور ۹۸

حضرت ایوبؑ ۱۵

ب

باب ..... ۲۳، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۴، ۹۶

بروج ..... ۳۷، ۴۱

باطن ..... ۸۰، ۸۲

برتریٔ شرفی ۱۰۵

برتریٔ مکانی ۱۰۵

بیعت ۵۵

پ

پنجتنِ پاک ۹

پیکرِ نورانی ۴

ت

تاویل ..... ۴، ۱۴، ۱۸، ۲۰، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۴، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۹۰، ۹۱

تائید ..... ۲۵، ۷۲

ترقّی یافتہ انسان ۴

تقدّمِ زمانی ۱۰۳

تقدّمِ شرفی ۱۰۳

تصویرِ لطیف ۹۹

تنزیل ..... ۴، ۱۸، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۸۱

تورات ..... ۲، ۳

توحید ..... ۷۲، ۹۱، ۱۰۵

ج

حضرت جبرائیلؑ ..... ۲۳، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴

جُثّۂ ابداعیہ ۴

جدّ ..... ۲۳، ۳۰، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۶

جسمِ کُل ..... ۶۵، ۸۹، ۹۵، ۹۷، ۱۰۲

جسمِ لطیف ..... ۴، ۹۹

جسمِ مثالی ۴

جسمانی کُل ..... ۹۲، ۹۷

جنّ ۵۴

جنت العَدن ۱۰۰

جنگِ علمی ۴۰

جوہرِ علوی ۲۵

جوہرِ سفلی ۲۵

جہاد ۱۱۰

چ

چراغ ..... ۴، ۴۲، ۶۵، ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۵

ح

حبلُ اللہ ..... ۸، ۱۱۳، ۱۱۴

حج ..... ۱۱۲، ۱۱۳

حجّتِ اعظم ..... ۲۳، ۴۱، ۷۹

حجّتِ روز ۴۱

حجّتِ شب ۴۱

حجّت ..... ۲۳، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۷۹، ۸۰

حجتانِ جزائر ۴۴

حدِّ تالیف ۱۷

حدِّ تاویل ۱۷

حدِّ ترکیب ۱۷

حدِّ عدل ۱۷

حدِّ جسمانی ۳۱

حدِّ وحدتِ حدود ۱۷

حدودِ جسمانی ..... ۳۰، ۸۰

حدودِ دین ..... ۳، ۴۳، ۴۶، ۷۸، ۷۹

حدودِ روحانی ..... ۳۰، ۳۱

حدودِ سفلی ..... ۵۵، ۷۹، ۸۰، ۸۱

حدودِ عُلوی ..... ۵۵، ۸۰
پیر حسن کبیر الدّینؒ ۴۱
حقیقت ۲
حکمتِ بالغہ ..... ۱۱، ۵۳
حمد ..... ۲۴، ۲۵
حضرت حوّاؑ ۱۰۱
حواسِ خمسہ ۸۰
حوائے معنیٰ ۲۵
حیوانِ صامت ..... ۴۶، ۵۰
حیوانِ ناطق ..... ۴۶، ۵۰

خ

خانۂ کعبہ ۷۱
خداوندِ تاویل ۵۸
خزینۂ الٰہی ۲۴
خیال ..... ۲۳، ۳۱، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۳، ۴۶

د

داعی ..... ۲۳، ۳۵، ۳۶، ۴۲، ۴۳، ۴۶، ۷۹
داعی مطلق ..... ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۳، ۴۴، ۹۶
داعی محدود ..... ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۳، ۴۴، ۹۶
داعی مکفوف ..... ۴۳، ۴۴
حضرت داؤدؑ ۱۵
دَورِ قائم ۴۷
دَورِ قیامت ۱۱۵
دَورِ کہین ۱۰۷
دَورِ مہین ..... ۹۰، ۱۰۷
دیدارِ جسمانی ۵۸
دیدارِ روحانی ۵۸
دینِ قائم ۱۱۶
دینِ قیّم ۴۳

ر

رحمتِ کلّ ۱۰۵
رشتۂ نور ..... ۸۹، ۹۰
رضوان ۸
رکوع ۵۳
روحِ قدسی ۱۳
روحِ انسانی ۱۳
روحِ حیوانی ..... ۱۲، ۱۳
روحِ کُل ..... ۸، ۱۰۵
روحِ ناطقہ ۱۳
روحِ نامیّہ ۱۳
روحِ نباتی ۴۹
روحانی سائنس ۴
روحانی کُل ..... ۹۲، ۹۷، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲
مولانا رومی ..... ۷۱، ۱۰۰

ز

زادالمسافرین ۱۳
زیتون ..... ۶۸، ۷۵

س

شجرۂ طیبہ .... ۲۲، ۲۳

سرائر و اسرار النّطقاء ۳

سفینۂ نجات ۱۶

حضرت سلمان فارسیؓ ۴۱

مولانا سُلطان محمد شاہؑ .... ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴

حضرت سلیمانؑ ۱۵

ش

شریعت .... ۲، ۲۶، ۲۷، ۸۱

شکلِ روحانی ۱۰۰

شکلِ نورانی .... ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲

حضرت شمس تبریزؒ .... ۴۱، ۷۱

شہداء ۱۰۰

ص

پیر صدرُالدّینؒ ۴۱

صراطِ مستقیم ۲

صورتِ رحمانی ۱۰۰

صورتِ لطیف ۸۹

صورتِ نورانی ۷۲

ط

طاق .... ۶۸، ۷۰

طریقت ۲

ظ

ظلمتِ طبیعی ۶۶

ظلمتِ روحانی ۶۶

ظلمتِ عقلانی ۶۶

ع

عالؑ ۲۵

عالمِ آفاق .... ۱۶، ۷۸

عالمِ ارواح ۱۷

عالمِ امر .... ۲۱، ۱۰۴

عالمِ بالا ۸۹

عالمِ تصوّر ۹۸

عالمِ جسمانی .... ۶۶، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴

عالمِ خلق .... ۲۱، ۷۸

عالمِ دین .... ۳۶، ۳۷، ۴۱، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۶۷، ۷۸، ۷۹، ۹۵

عالمِ روحانی .... ۱۷، ۲۹، ۶۶، ۸۹، ۱۰۲، ۱۰۴

عالمِ سفلی ۳۶

عالمِ ظاہر ۴۵

عالمِ عقل ۱۰۴

عالمِ عقلانی ۶۶

عالمِ عُلوی .... ۳۶، ۸۹

عالمِ گیر روح ۹۷

عالمِ لطیف .... ۹۵، ۱۰۱

عالمِ مجرّدِ عقول ۹۱

عالمِ وحدت ۷۸

عالمِ نورانی ۱۰۲

عالمگیر روح ۸۴

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

عرش ..... ۲۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۶، ۱۱۰
عروۃ الوثقیٰ ۸
عقلانی عمل ..... ۷۲، ۷۳
عقولِ عطائی ۵۰
عقولِ اکتسابی ۵۰
عقلِ جزوی ۱۹
عقلِ کُلّ ..... ۸، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۴۴، ۳۹، ۴۶، ۵۷، ۶۱، ۷۲، ۸۱، ۸۰، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۶
علّتِ اولیٰ ۲۴
علمُ الاسماء ..... ۲۴، ۱۰۰، ۱۰۱
علمِ اکتسابی ۵۰
علم الکتاب ۸۷
علم البیان ۹۰
علمِ تاویل ..... ۳۴، ۴۰، ۸۰
علمِ توحید ..... ۳۴، ۴۱، ۸۰
علمِ حدود ..... ۳، ۳۴، ۸۱
علمِ حقائقِ اشیاء ۱۱
علمِ دین ۷۹
علمِ روحانی ۴
علمِ عطائی ۵۰
علمِ قرآن ۸۶
علمی زکات ۳
حضرت علیؑ ..... ۲، ۸، ۹، ۲۰، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۴۱، ۵۶، ۵۹، ۷۱، ۷۲، ۸۶، ۸۷، ۸۹، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴
شہزادہ علی سلمان خانؑ ۸
عناصرِ اربعہ ۴۹
حضرت عیسیٰؑ ..... ۱۵، ۲۵، ۳۸، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۸

غ

غذائے جلالی ۱۲

ف

فتح ..... ۲۳، ۳۱، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۴۶
فرشتۂ جلالی ..... ۲۰، ۷۳
فرشتۂ جمالی ۲۰
فرشتۂ خیال ۳۱
فرشتۂ عشق ۳۰
فرعون ۲۷

ق

قارون ۳
قانونِ منطق ۳۲
حضرت قائم القیامتؑ ..... ۳، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۸۱، ۸۹، ۹۰، ۱۰۸
قلم ..... ۲۴، ۲۵، ۳۸، ۳۹، ۷۳، ۱۰۳
قوّتِ باصرہ ۸۰

قوّتِ ذائقہ ۸۰
قوّتِ روحانی ۹۸
قوّتِ سامعہ ۸۰
قوّتِ شامہ ۸۰
قوّتِ لامسہ ۸۰
قوّتِ فہم ۳۱
قوّتِ نطق ۳۰
قیصر ۱۴

ک

کتابِ مبین ..... ۱، ۲
کتابِ ناطق ۲۶
کرسی ..... ۲۵، ۱۰۲، ۱۰۶
مولانا شاہ کریم الحسینیؑ ..... ۲، ۸، ۱۱۵، ۱۱۶
کلامِ غیبی ۷۵
کلمۂ باری ..... ۲۱، ۲۳
کلمۂ طیبہ ..... ۲۲، ۲۳
کلمۂ فرمان ۲۱
کلمۂ کُن ..... ۲۱، ۴۷، ۹۰
کلمۂ واحدہ ۲۱
کوکبی بدن ۴

گ

گوہرِ عقل ..... ۷۶، ۹۱

ل

حضرت لقمانؑ ۱۱
لوح التّاویل ۸۸
لوحِ محفوظ ..... ۲۵، ۳۸

م

ماذون ..... ۴۳، ۷۹
ماذونِ مطلق ..... ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۴، ۹۶
ماذونِ محدود ..... ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۴، ۹۶
مالی زکات ۳
مبداء ۸۴
مُبدع ..... ۲۱، ۳۹
مجوہر الجواہر ..... ۲۴، ۲۵
مستجیب ..... ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۳، ۴۴، ۹۶
حضرت محمد مصطفیٰؐ ..... ۱، ۸، ۹، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۲، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۸، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۷۱، ۸۲، ۸۶، ۸۷، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰
مرکبِ حیوانی ۱۳
معاد ..... ۲۱، ۸۴، ۶۰
معراج ۱۵
معرفت ۲
معرفتِ ربّ ۴۲
معرفتِ نفس ۴۲
معلّمِ نورانی ۲

معلّمِ ربّانی ۱
ملکِ خدا ..... ۲۴، ۲۵
موالیدِ ثلاثہ ..... ۱۲، ۱۳
حضرت موسیٰؑ ..... ۱۵، ۲۵، ۲۶، ۳۸، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۸
حضرت میکائیلؑ ..... ۲۳، ۳۱، ۳۴، ۴۲

ن

پیر ناصر خسروؒ ..... ۱۳، ۴۱، ۴۹
ناطق ..... ۱۷، ۲۲، ۲۶، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۴، ۴۶، ۶۱، ۷۰، ۷۱، ۸۱، ۱۰۳، ۱۰۶
نفسِ حیوانی ۱۳
نفسِ کُلّ ..... ۱۷، ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۴، ۴۶، ۵۴، ۵۷، ۶۱، ۷۰، ۷۲، ۸۱، ۹۷، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶
نفسِ واحدہ ۲۵
نصاریٰ ۸۷
نماز ..... ۵۳، ۱۱۲، ۱۱۳
حضرت نوحؑ ..... ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۲۵، ۳۸، ۳۹، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۱۰۸
نورِ امامت ..... ۲، ۳، ۷۰
نورِ الٰہی ۴
نورِ رحمت ۱۰۴
نورِ روحانی ۶۶
نورِ عقلانی ۶۶
نورِ طبیعی ..... ۶۴، ۶۵، ۶۶
نورِ نبوت ..... ۱، ۳، ۴
نورِ محمدؐ ۱۰۳
نورِ معرفت ۴
نورانی دیدار ۵۶

و

وحی ..... ۱۶، ۲۶، ۳۲، ۳۳، ۷۱

ہ

حضرت ہارونؑ ۲۶
ہویّت ..... ۳۸، ۳۹
ہیولیٰ ۸۹

ی

حضرت یوسفؑ ..... ۸، ۱۵
یہود ۸۷
یوم الآخر ۳۳

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آپ اپنے زمانے کے اعجوبۂ روزگار ہستی تھے، آپ نے کسی تعلیمی ادارے سے حصولِ تعلیم کے بغیر روحانی ریاضت کی برکت سے قرآنی تاویل اور حکمت پر نظم و نثر میں ایک سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں، آپ چار زبانوں برشسکی، اردو، فارسی اور تُرکی کے قادرالکلام شاعر ہیں، آپ اپنی مادری زبان برشسکی کے اوّلین شاعر اور صاحبِ دیوان ہیں، آپ نے قرآنی حکمت کی روشنی میں "روحانی سائنس" کا انکشاف کیا ہے، جس کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہو رہی ہے، اس منفرد تحقیقی خدمت کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نوازا ہے، برشسکی زبان کی ترقی اور قوم کی سماجی زندگی میں اصلاح کیلئے آپ کی کوششیں مُنفرد ہونے کے باعث آپ بابائے برشسکی، حکیمُ القلم اور لسانُ القوم کے القاب سے مشہور ہیں۔ آپکی گرانمایہ تخلیقات کے چند نمونے یہ ہیں، میزانُ الحقائق، عملی تصوّف اور روحانی سائنس، رُوح کیا ہے؟، کتابُ العلاج، قرآنِ حکیم اور عالمِ انسانیّت، اور آپکے جمع کردہ مواد پر مشتمل اوّلین برشسکی-اُردو لُغت جو آپ کی رہنمائی میں مرتّب ہو کر کراچی یونیورسٹی سے شائع ہوگئی ہے، اسکے علاوہ آپ برشسکی-جرمن ڈکشنری اور ہونزہ پروورب (HUNZA PROVERBS) کی تدوین میں بالترّتیب ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے پروفیسر برگر اور یونیورسٹی آف مانٹریال کے پروفیسر ٹیفو کے بھی ہمکار مصنّف (CO-AUTHOR) رہے ہیں۔

ISWLS

9 781903 440926